سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ
ایک ادیب
ایک صحافی
مرتب :- نسیم اختر شاہ قیصر استاد دارالعلوم (وقف) دیوبند
معہد الانور
علامہ انور شاہ روڈ دیوبند ۔ ۲۴۷۵۵۴

سید محمد ازہر شاہ قیصرؔ
ایک ادیب ایک صحافی

مرتب

نسیم اختر شاہ قیصر

ناشر

معہد الانور علامہ انور شاہ روڈ عقب عیدگاہ

۲۴۷۵۵۴
دیوبند

تفصیلات

نام کتاب :- سید محمد ازہر شاہ قیصر
ایک ادیب، ایک صحافی

مُرتّب :- نسیم اختر شاہ قیصر

صفحات :- ۱۹۲

سنِ اشاعت :- ۲۰۰۴ء

کتابت :- محمد اسرائیل غفرلہٗ القاسمی دیوبند

قیمت :-

ناشر

معہد الانور دیوبند یوپی ۲۴۷۵۵۴

فہرست

۱۹ر سال قبل دیوبند ایک ادیب اور صحافی سے محروم ہوا، ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کو یہ ایک خراجِ عقیدت ہے۔ اس مجموعہ میں کچھ نئے اور کچھ پرانے مضامین شامل ہیں نئے مضامین لکھنے والوں میں مفسرِ قرآن مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی زید مجدکم، جناب محترم ڈاکٹر تابش مہدی صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈاکٹر عبید اقبال عاصم صاحب، جناب محترم حامد تحسین صاحب، مولانا راشد وحید قاسمی صاحب وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں، یہ تمام مضامین شاہ جی مرحوم کی ذاتی زندگی، خدمات اور ادبی کاموں پر مشتمل ہیں، میں ان تمام حضرات کا دل کی گہرائیوں سے شکر گذار ہوں، محترم ڈاکٹر تابش مہدی صاحب نے اپنے وقیع اور گرانقدر مقدمہ سے نوازا اور اس کتاب کا نام بھی تجویز کیا، اس کے لئے ان کا ممنون ہوں، قدم قدم پر ان کی رہنمائی میرے شاملِ حال رہی۔

عمِ محترم محدثِ عصر حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی دامت برکاتہم کا مضمون اور قیمتی رائے بھی اس مجموعہ کی زینت ہیں، ان کا شکریہ مجھ پر واجب ہے، خداوند قدوس ان کو صحت وعافیت سے نوازے رکھے اور ان کی سرپرستی ہمیشہ کی طرح ہمیں حاصل رہے۔

برادر محترم ومکرم مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کی دلچسپی کی بنا پر اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی، اور ان کے خصوصی تعاون نے اس مرحلہ کو آسان کیا، دیگر احسانات کی طرح ان کا یہ احسان لائقِ ستائش ہے، میں ان کی خدمت میں بھی ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

لگ بھگ آٹھ سال قبل والدِ مرحوم کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ "مقبول تقریریں" کے نام سے منظرِ عام پر آیا جس کے کئی ایڈیشن بحمد اللہ سامنے آچکے ہیں اس اعتبار سے بھی اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ دوسری بار ان پر کچھ کام ہوا ہے۔ اور یہ سب کچھ محض فضلِ الٰہی سے ہی ممکن ہو سکا۔

اس مجموعہ میں کچھ مضامین ایک ہی عنوان کے تحت ہیں، اور ہر صاحبِ مضمون نے اسی عنوان کو باقی رکھنے کی تاکید کی اس لئے ان کو بدلنے کی ہمّت نہ ہوئی، اور یہ ہمت اس لئے بھی نہ ہوئی کہ یہ عنوان شاہ صاحب مرحوم کی زندگی سے خوب میل کھاتا ہے، واقعی انھوں نے درویشانہ زندگی گذاری اور پورے خلوص و دیانت کے ساتھ زندگی کے آخری ایام تک تحریر و قلم سے رشتہ جوڑے رکھا، برادرم سید اطہر شاہ صاحب، برادرم سید راحت شاہ صاحب، عزیزم سیّد وجاہت شاہ صاحب اور خاندان کے تمام افراد کی جانب سے اپنے والد، عزیز اور بزرگ کے تئیں محبتوں کا یہ گلدستہ اہلِ تعلق اور اربابِ نظر کی خدمت میں پیش ہے۔

موقع کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اخبارات و رسائل کا ذکر بھی یہاں کیا جائے جن میں والدِ مرحوم کے مضامین و مقالات شائع ہوتے، تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد جو رسائل و جرائد شائع ہوتے تھے ان میں سے ۹۹ فیصد ماضیٔ مرحوم کا حصہ بن چکے ہیں، اکا دکا اگر کوئی اخبار یا رسالہ زندہ بھی ہے تو وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہے، والدِ مرحوم کے شاندار صحافتی اور ادبی سفر کے گواہ یہ رسائل ہیں جن سے ان کے تحریری اور قلمی رشتے مسلسل اور ہمیشہ استوار رہے۔

ہفت روزہ "الحمرا" بھوپال۔ ماہنامہ "کہکشاں"، دہلی۔ ہفت روزہ "اجتماع" لاہور روزنامہ "انقلاب"، لاہور۔ روزنامہ "انصاری"، دہلی۔ روزنامہ وسہ روزہ "الجمعیۃ" دہلی روزنامہ "زمیندار"، لاہور۔ روزنامہ "آفتاب" لکھنؤ۔ ہفت روزہ "اجتماع"، سہارنپور ماہنامہ "مبلّغ"، امرتسر۔ روزنامہ "ملاپ"، دہلی۔ روزنامہ و ہفت روزہ "قومی آواز"، دہلی۔ روزنامہ "دعوت" دہلی۔ ہفت روزہ "شباب"، دہلی۔ ہفت روزہ "صداقت"، سہارنپور روزنامہ "عصرِ جدید" کلکتہ۔ ہفت روزہ "چٹان"، لاہور۔ ماہنامہ "الرشید" ساہیوال ہفت روزہ "شانِ ہند" دہلی۔ روزنامہ آفتاب سری نگر کشمیر، "سری نگر ٹائمز"، سری نگر کشمیر۔ روزنامہ "مدینہ" بجنور

پندرہ روزہ "شمس الاسلام" بھیرہ پنجاب۔ ہفت روزہ "نیا ولولہ" سری نگر کشمیر۔ روزنامہ "تنویر" دہلی۔ پندرہ روزہ "عقائد" سہارنپور۔ سہ روزہ "زمزم" لاہور۔ پندرہ روزہ "حنفی" سری نگر کشمیر۔ ہفت روزہ "بیباک" سہارنپور پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنو۔ روزنامہ "عزائم" لکھنو۔ روزنامہ "نوید دکن" حیدرآباد۔ ماہنامہ "نیا دور" لکھنو۔ ہفت روزہ "نقیب" پٹنہ۔ سہ روزہ "دعوت" لاہور۔ روزنامہ "ہمدرد" سری نگر کشمیر۔ ماہنامہ "فاران" لندن سہ روزہ "الامان" دہلی۔ ہفت روزہ "نئی دنیا" دہلی۔ ہفت روزہ "دلیر" سوپور کشمیر۔ پندرہ روزہ "مکتوب" سری نگر کشمیر۔ ہفت روزہ "ندائے ملت" لکھنو۔ ماہنامہ "پیغام حق" لاہور۔ ہفت روزہ "صدق جدید" لکھنو۔ سہ روزہ "عادل" دہلی۔ سہ روزہ "نیر اسلام" لاہور۔ ماہنامہ "بینات" کراچی۔ روزنامہ "جرات" مرادآباد۔ ماہنامہ "تاج" لاہور۔ پندرہ روزہ "ضیاء الاسلام" امرتسر۔ ماہنامہ "پیغام" لندن۔ ماہنامہ "فاران" کراچی۔ ماہنامہ "نور" جالندھر۔ ماہنامہ "عارف" لاہور۔ ماہنامہ "المنظور" بدایوں۔ ہفت روزہ "شہاب" لاہور۔ ماہنامہ "شہباز" جالندھر ماہنامہ "سہاگ" جالندھر۔ ماہنامہ "ساقی" جالندھر۔ ماہنامہ "حور" لاہور۔ ماہنامہ "شمس الاسلام" جالندھر۔ ہفت روزہ "الواحد" بجنور۔ روزنامہ "نوائے پاکستان" لاہور۔ ہفت روزہ "معرکہ" دہلی۔ ماہنامہ "دین دنیا" دہلی۔ ہفت روزہ "پیام مشرق" دہلی۔ ماہنامہ "آستانہ" دہلی۔ ہفت روزہ "آزاد" سہارنپور۔ ہفت روزہ "ایشیا" لاہور۔ ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور۔ ہفت روزہ "بیدار" مظفر نگر۔ ہفت روزہ "واعظ" لاہور۔ ماہنامہ "پیام اسلام" جالندھر۔ ماہنامہ "مسلم" جالندھر۔ ماہنامہ "قاسم العلوم" دیوبند۔ پندرہ روزہ "میقات" دیوبند۔ پندرہ روزہ "غریب" دیوبند۔ ماہنامہ "ہلال" دیوبند۔ ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند۔ ماہنامہ "ہادی" دیوبند۔ ماہنامہ "تجلی" دیوبند۔ ماہنامہ "خالد" دیوبند۔ ماہنامہ "قاسم" دیوبند۔ ماہنامہ "طیب" دیوبند۔ پندرہ روزہ "اشاعت حق" دیوبند۔ پندرہ روزہ "مرکز" دیوبند۔ "دیوبند ٹائمز" دیوبند۔ پندرہ روزہ "اجتماع" دیوبند۔ پندرہ روزہ "نگراسیاٹ" دیوبند۔ پندرہ روزہ "دیوبند ایکسپریس" دیوبند۔ پندرہ روزہ "انور" دیوبند۔ پندرہ روزہ "استقلال" دیوبند۔ ماہنامہ "الاصغر" دیوبند۔ پندرہ روزہ "چراغ حرم" دیوبند۔ ماہنامہ "نقش" دیوبند

یہ وہ نام ہیں جو احقر کے پاس موجود ہیں اور جن سے میں نے ایک انتخاب "مضامین قیصر" کے نام سے کیا ہے، جو کتابت کے مرحلہ سے گذر کر اب طباعت کا منتظر ہے۔ دیکھئے یہ انتظار کب ختم ہوتا ہے اور کب وہ صبح روشن ہوتی ہے جو اس انتخاب کے طباعتی بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر ہمیں بے فکر کرتی اور مزید کاموں کا حوصلہ بخشتی ہے۔

محترم ڈاکٹر تابش مہدی صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

مقدمہ

ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی اردو ادب کے عناصر اربعہ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اسلوبِ تحریر اور اپنی ادبی نظریہ سازی کے ذریعہ اردو شعر و ادب کی روایت کو آگے بڑھایا ہے، ہندوستان کی مردم خیز بستی دیوبند کے شعری و ادبی حوالے سے بھی چار نام بہت نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں ان میں پہلا نام علامہ انور صابری کا ہے، جنھوں نے اپنی شاعری اور بدیہہ گوئی کے ذریعہ شہرت و مقبولیت حاصل کی، دوسرا مولانا عامر عثمانی کا، جنھوں نے اپنے ماہانہ رسالہ تجلّی کے ذریعہ اپنی تخلیقی تنقیدی اور صحافتی صلاحیتوں کا اعتراف کروایا، تیسرا نام جناب جمیل مہدی کا ہے، جنھوں نے دیوبند سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا، اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے، وہاں سے روزنامہ عزائم جاری کیا اور آخری عمر تک عزائم ہی کے ذریعہ اپنی ذہانت و فطانت کا لوہا منواتے رہے، اور چوتھا نام ابن الانور مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر (۱۹۲۰ - ۱۹۸۵) کا ہے، جو اوائل عمری ہی سے صحافت کے دامن گرفتہ ہوئے تو زندگی کے آخری سانس تک اس کی وفاداری سے منہ نہیں موڑا۔

مولانا سید ازہر شاہ قیصر اردو کے معتبر صحافی بھی تھے اور شگفتہ قلم ادیب و انشاپرداز بھی، شاعری اور افسانہ نگاری سے بھی شغف رکھتے تھے، وہ شروع میں اخبار استقلال دیوبند، صداقت سہارنپور، انور دیوبند، ماہنامہ خالد دیوبند، ہادی دیوبند اور اخبار اجتماع لاہور سے وابستہ رہے اور اپنی قلمی اور صحافتی شناخت قائم کی، اس کے بعد سنہ ۱۹۵۱ء سے دارالعلوم دیوبند کے علمی و فکری ترجمان ماہنامہ "دارالعلوم" سے وابستہ ہو گئے، اور سنہ ۱۹۸۲ء تک اسی سے وابستہ رہے۔ اگرچہ وہ ایک درویش صفت قلندر مزاج، گوشہ نشین اور عزلت پسند صحافی تھے،

ہم ان کے قلم میں بلا کی شوخی اور دلآویزی تھی، ان کا مطالعہ بہت وسیع اور ہمہ جہتی تھا، اس سلسلے میں انھوں نے ہمیشہ کشادہ نظری اور وسیع المشربی سے کام لیا ہے، جو عمق اور ٹھہراؤ ان کے مشاہدے میں تھا وہ بہت کم لکھنے والوں کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے، رسالہ "دارالعلوم" میں ان کے اداریوں کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، متعدد معاصر جرائد انھیں اپنے ہاں نقل کرتے تھے، انھوں نے ماہنامہ "دارالعلوم" کے اداریے میں لکھا تھا:

"یہ سائنسی ایجادات، چاند پر پہونچنے کی جدوجہد، اور انسانی زندگی کو فائدہ پہونچانے والی یہ ترقیات اپنی جگہ پر ایک حقیقت سہی، مگر ان ترقیات کا یہ پہلو انسانیت کے لئے کس قدر تکلیف دہ، کس قدر افسوسناک اور کتنا مہیب ہے کہ ان ایٹمی ایجادات نے ساری کائناتِ انسانی، دنیا کی ساری رونق اور گرماگرمی، بڑے بڑے ملکوں، میلوں تک پھیلے ہوئے شہروں، عظیم الشان کارخانوں اور ملوں اور اپنے گوشۂ عافیت میں طویل مصروفیت کے بعد ستانے اور آرام لینے والے انسان کے لئے ہولناک تباہی اور ہمہ گیر بربادی کی منزل کو قریب سے قریب کردیا ہے، آج ساری دنیا کی زندگی اور موت کا اختیار روس و امریکا کے ایٹمی ہتھیاروں کے ان پوشیدہ کمروں اور تہہ خانوں میں کام کرنے والے افسروں کے ہاتھ میں ہے، جن میں ان دونوں ملکوں نے انسانی زندگی کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قسم قسم کے ایٹمی ہتھیار جمع کر رکھے ہیں (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۲)

یہ مولانا سید ازہر شاہ قیصرؔ کی کم و بیش نصف صدی پہلے کی تحریر ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آج کی تحریر ہے، جن خطروں اور اندیشوں کی طرف اس میں اشارے کئے گئے ہیں، وہ سب حقیقت کی شکل اختیار کر گئے ہیں اور آج کا انسان پورے طور پر ان سے دوچار ہے۔ اقبالؔ نے شاعر کو "دیدۂ بینائے قوم" سے تعبیر کیا ہے، اس لئے کہ قوم و ملت پر جب بھی کوئی وقت آتا ہے سب سے پہلے شاعر اس سے اثر قبول کرتا ہے، روتا ہے اور آنسو بہاتا ہے۔ میرے نزدیک ایک حقیقی صحافی بھی اس زمرے میں آتا ہے، اس کے سینے میں بھی وہ دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے، جو قوم و ملت کے دکھ درد پر تڑپ اٹھتا ہے، مولانا سید ازہر شاہ قیصرؔ بھی ایک حقیقی

صحافی تھے، اللہ نے انھیں بھی ایک حساس دل دیا تھا، جب بھی ملت پر کوئی برا وقت آتا تھا، یا انسانی دنیا کسی سانحے سے دوچار ہوتی تھی تو وہ مضطرب ہو جاتے تھے، بلکہ آنے والے خطروں کو پہلے ہی اپنی خداداد ذہانت و فطانت سے محسوس کر لیتے تھے اور اپنی حیثیت و بساط کے مطابق ان سے نبرد آزمائی کے لئے کمربستہ ہو جاتے تھے، منقولِ بالا تحریر ان کے اس رویے کی کامل نشان دہی کرتی ہے۔

مولانا سید ازہر شاہ قیصر ہمارے ان منفرد و صاحبِ طرز انشا پردازوں اور ذہین و فطین صحافت نگاروں میں تھے، جنھوں نے اپنی علمی و فکری نگارشوں، دل کش تحریروں اور مثبت و تعمیری قلمی رویوں سے علم و قلم سے وابستہ ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا ہے، انھوں نے جب اور جس موضوع پر بھی لکھا ہے اس کے ہمہ جہتی عواقب و نتائج اور دوررس اثرات کو سامنے رکھ کر لکھا ہے، جذباتیت، عجلت پسندی اور تحزب و گروہ بندی سے انھوں نے ہمیشہ اجتناب کیا ہے، ان کے قلم کا یہ ایک ایسا وصف ہے جو انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز و نمایاں کرتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب "مولانا سید ازہر شاہ قیصر: ایک ادیب ایک صحافی" ان مقالات اور مضامین کا مجموعہ ہے، جو ان کے سانحۂ وفات کے بعد ملک کے چند علماء، دانشوروں اور ادیبوں نے لکھے تھے اور ماہنامہ طیب دیوبند نے انھیں "شاہ نمبر" کے عنوان سے اپنے خصوصی شمارے کے طور پر شائع کیا تھا، کتاب کے مؤلف جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر ایک ذی استعداد عالم دین اور سنجیدہ اہلِ قلم ہیں، علم و قلم کی دولت انھیں خاندانی طور پر ورثے میں ملی ہے، وہ امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کے پوتے، رئیس القلم حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کے فرزندِ ارجمند اور عصرِ حاضر کے جید عالمِ دین و محدث، حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند کے برادر زادے ہیں، ان اہم اور برگزیدہ نسبتوں نے ان کی خداداد صلاحیت و صالحیت کو دوچند کر دیا ہے، انھوں نے ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر کے اردو کے سوانحی ذخیرے میں ایک خوشگوار اضافہ کیا ہے، ان شاء اللہ دیوبند کی علمی، ادبی اور صحافتی تعیینِ قدر میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

میں اس کتاب کی ترتیب و اشاعت پر اپنے عزیز بھائی مولانا نسیم اختر شاہ قیصر

دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ وہ علم و تحقیق اور تصنیف
ف کی راہ پر پوری صحت و توانائی اور کامل نشاط و یکسوئی کے ساتھ گامزن رہیں

ادبیاتِ عالیہ اکادمی
جی ۵/اے ۔ ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

تابش مہدی
۲۰۰۴/ ۴ / ۲۰

جس سے آپ کی قرابت یا رشتہ داری نہ ہو، جو آپ کا بڑا یا عمر میں آپ سے کم ہو، جو آپ کا مربّی اور آپ کی زندگی کا کوئی حصہ اس کے زیرِ تربیت نہ گذرا ہو، یا آپ آخری درجہ کے احسان فراموش اور محسن کشی میں طاق ہوں، جس نے اپنی زندگی، مصروفیات، مشاغل افتادِ طبع اور عادات وخصائل کے بڑے حصے آپ سے چھپا کر رکھے ہوں، اور آپ کے سامنے عیب وہنر کھل کر نہ آئے ہوں، خصوصیات وانفرادیت پر دبیز پردے پڑے ہوں اس پر کہنا سننا، لکھنا پڑھنا کس قدر آسان اور ہر مرحلہ صاف وشفاف شاہراہ پر گامزنی ہے۔

لیکن اگر قضیہ برعکس ہو، خاندان ایک، ماں باپ ایک، بڑا بھائی، مربّی اور مزکّی، اس کی زندگی کے تمام پہلو، نشیب وفراز، فطرت ونہاد، خصائل وشمائل سب کچھ آپ کے روبرو ہوں تو آپ اگر واقعات وحقائق قلمبند کریں تو دوسروں کی نظر میں مبالغہ، قصیدہ خوانی، یا مرثیہ نگاری، کون سی انسانی زندگی ہے (انبیاء علیہم السلام کے استثنار کے بعد) جس میں کوتاہی کا نام ونشان، کمی وکجی کا فقدان نہ ہو۔ اگر قلم زندگی وحیات کے کم قیمت پہلو سامنے لائے تو بغض وعداوت، بدگمانی ونشترِ کینہ کے الزامات سنئے، یہی وہ مقام ہے جس کے لئے "کج دار ومریز" شیشہ وسنگ کا کھیل کی کہاوت مشہور ہے۔ درحقیقت یہ جانگداز راہ کا سفر وجادہ پیمائی ہے، لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ برادرِ بزرگوار کے بارہ میں میرا قلم درست قدم میری نگارش واقعہ نگاری کی پگڈنڈیوں سے ادھر ادھر نہ ہوگی، انشاء اللہ۔ خاندانی اثرات غیر شعوری، غیر ارادی طور پر منتقل ہوتے ہیں اس کا انکار ابلہی ودیوانگی ہے۔

مرحوم بھائی جس خاندان سے تعلق رکھتے ان سب کا ذکر و تذکار تو طولِ عمل، صرف ان کے نامور گرانمایہ، گرانقدر باپ کو سامنے رکھئے، جن کے بے پایاں علوم کے دوست دشمن، اپنے اور غیر عجم و عرب قائل ہیں، وہ شرافتِ نفس، مکارمِ اخلاق، فضل و کمال، تبحر و تعمق، حفظ و ذکار، ذہانت و فطانت عبقریت و رزانت کے جلوۂ صد رنگ تھے، ان خصوصیات کا بیشتر حصہ وطنی، نسلی، خاندانی اوصاف کی زندہ نشانی تھی، برادر بزرگوار نے غیر شعوری طور پر انھیں جذب کیا، ہزاروں اشعار نوکِ زبان پر، سینکڑوں شخصیات کے تذکرے خزانۂ دماغ میں محفوظ، اس نسلی امتیاز کے مرقع تھے جس سے ان کا تعلق تھا، پھر بچپن، شباب کی ابتدا، والدِ مرحوم کے ساتھ سفر و اسفار میں شریک و رفیق، ان مجالس کو سنا جو حضرت علامہ کا امتیاز تھیں، ان نادر و نایاب شخصیتوں کی بزم آرائی آنکھوں سے دیکھی جو ہر جگہ علامہ کو اس طرح گھیر لیتیں جیسا کہ قمر کے ارد گرد ستارے سیارے، جذاب طبیعتیں طول وقت یا طویل زمانہ کی محتاج نہیں، مختصر وقت، محدود گھڑیوں میں جو دیکھ لیا، سن لیا، زندگی کے باقی مراحل بلکہ ہر منزل میں تازہ بتازہ، نوع بنوع ہو کر سامنے آتے رہتے ہیں، یہ فطری بات ہے نہ تصوف کا کوئی لطیف نکتہ نہ صوفیا کا کوئی سربستہ راز، نہ حاذق طبیب کا کوئی خزینہ جو عمر بھر رہا ہو دفینہ، نہ عاملوں کا وہ پر اسرار کرشمہ نہ جوگیوں کا کوئی چمتکار۔

شباب میں قدم رکھا تو قلم نے ہر قدم کا ساتھ دیا، انشا لطیف، ہر کثافت سے پاک، نوک و پلک درست، تعبیرات نادر، اسلوب یگانہ، قلم پر قدرتی بہرہ اتنا سخت ایسا جو کس کر نہ بہکا نہ بے راہ ہوا، عنوانات علمی یا ادبی، شخصیت نگاری ہو یا تاریخ کا کوئی اچھوتا واقعہ، وہی بانکپن، وہی سحر نگاری وہی لطیف مرقع، وہی جچی تلی بات، وہی متوازن انداز وہی موزوں و مناسب طرزِ ادا۔

برادر زادہ مولوی نسیم اختر شاہ استاذ درجات عربیہ عالیہ وقف دار العلوم اگرچہ طفولیت سے گذر رہا تھا لیکن خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ زمین بنجر نہیں بلکہ قابل کاشت تھی بے بنیاد نہیں بلکہ درست کار تھی جو کچھ مرحوم باپ سے سیکھ لیا انھی چراغوں کو اب روشن کر رہا ہے، جو پودے لگائے تھے انھیں کی آبیاری میں مصروف، مرحوم باپ پر اہل قلم کے تاثراتی مقالات و مضامین کو بصورت مجموعہ پیش کر رہا ہے، جس کا اصل تعارف گل گلزار رونقِ چمن، چمن کی فصل بہار، شجرِ سایہ دار، آبدار و تابدار ہے، خدا کرے کہ یہ کوشش مرحوم باپ کی روح کی سکینت، تودۂ خاک کا جامع تعارف اور خود اسکے مستقبل کی تعمیر شاندار پر شکوہ اور پر وقار ہو۔

این دعا از من و از خلائق جہاں قبول باد

درویش صفت شاہ جی علیہ الرحمہ

مفسر قرآن، حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ

میاں مولانا نسیم اختر شاہ خلف الصدق حضرت مولانا ازہر شاہ قیصر علیہ الرحمہ میرے مخدوم زادہ ہیں اور میرے کرم فرما اور محسن بڑے شاہ جی کے فرزند اکبر ہیں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ موصوف میرے غریب خانہ پر آئے اور میں ان کی خاطر تواضع نہ کر سکا۔ گلی میں کھڑے کھڑے بات ہوئی، وہ وقت میرے باہر ٹہلنے کا تھا، وہ میرے انتظار میں گلی کے اندر ٹہلتے رہے اور میں گلی سے باہر سڑک پر ٹہل رہا تھا، اسی ٹہلتے ٹہلتے میں بات ہوئی، میاں نسیم اپنے محترم والد پر مضامین کا مجموعہ شائع کر رہے ہیں اس کے لئے مجھے ایک مضمون تحریر کرنے کا حکم دے گئے ہیں۔ وہ میرے چھوٹے ہیں مگر میرے بزرگوں کی یادگار ہیں اس لئے وہ بھی میرے بڑے ہیں، محترم ہیں۔

حضرت شاہ جی، اللہ رب العالمین انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، میرے معاصر نہیں تھے، میں ان کے سامنے ایک حقیر طالب علم تھا پھر میں ان پر کیا مضمون لکھ سکتا ہوں۔

ہاں، ان کی مجھ پر جو کرم فرمائی تھی جو شفقت اور محبت ان کے قلب صافی کے اندر میرے لئے تھی اور جسے میں خدا تعالیٰ کا کرم ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس نے اس درویش صفت بندہ کے دل میں ڈال دی تھی نہ صرف میرے لئے بلکہ ان گنت طلبہ کے لئے، رفقاء کے لئے۔

حضرت شاہ جی رہ کا سب سے پہلے میں نے جمعیۃ علماء ہند کے اکابرین ثلثہ (مولانا حفظ الرحمٰن مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا محمد میاں علیہم الرحمہ والرضوان) کی مجلس میں تذکرہ سنا۔

اچھے لکھنے والوں کا ذکر ہو رہا تھا، مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط ایڈیٹر الجمعیۃ اور بلال احمد صاحب زبیری ایڈیٹر انصاری اخبار بھی مجلس میں موجود تھے۔ مفتی صاحب نے فرمایا:

دارالعلوم دیوبند کے مدیر ازہر شاہ قیصر دارالعلوم کے اداریے (حرفِ آغاز) بڑی محنت سے لکھتے ہیں زبان بھی پر شوکت ہوتی ہے اور فکر بھی صائب ہوتا ہے، فارقلیط صاحب نے مفتی صاحب کی تائید کی، البتہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مفتی صاحب کی پرشوکت زبان پر فرمایا:

اب دور آسان اردو زبان لکھنے کا ہے، ازہر شاہ کے سامنے علماء کا طبقہ رہتا ہے، اگر وہ مسلم عوام کو سامنے رکھیں تو انھیں احساس ہو، مولانا آزاد نے بھی رام گڑھ کانگریس کے خطبہ میں اپنی پرشوکت اور پروقار زبان کے بجائے آسان اور عام فہم زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے ازہر شاہ مولانا آزاد کے الہلال اور البلاغ کو دیکھتے ہیں۔

میں اس وقت مدرسہ عالیہ فتحپوری کا طالب علم تھا، آخری جماعت تھی اس کے بعد دو سال کے لئے دارالعلوم دیوبند آگیا۔ اب میں نے اس درویش صفت آدمی کو بیت الہاجرہ (قیام گاہ مولانا سلطان الحق صاحب ناظم کتب خانہ) میں شام کی مجلسوں میں آتے جاتے دیکھا۔

میں اور میرے رفیق (مولانا انظار الدین دہلوی) نے پہلا سال بیت الہاجرہ کے ایک بیرونی کمرہ میں گذارا، مولانا سلطان الحق صاحب ہم دونوں کو اپنے پاس لے آئے تھے اور باہر کا کمرہ ہمیں دیدیا تھا، مرحوم کے اندر بڑی حمیت تھی اور بڑی سمجھداری تھی۔

بیت الہاجرہ کی مجلس میں مولانا محمود گل صاحب، مولانا اصلح الحسینی اور بزرگوں میں مولانا جلیل احمد صاحب اور شاہ جی شریک ہوتے تھے۔

مولانا اصلح الحسینی تحریر وانشاء کے میدان میں صاحب کمال تھے اور ساتھ ہی شکل وصورت میں صاحب جمال بھی تھے اور گل صاحب جیسا گل و زار آدمی اصلح صاحب سے خوش طبعی کرنے میں سب سے آگے رہتے تھے۔

ہم دلی والے (مولانا انظار الدین مرحوم مہاجر کراچی) صرف مغرب کی نماز میں شامل ہوتے تھے، اور بڑوں کی مجلس میں شرکت کی بے ادبی سے بچتے تھے، کبھی کبھار مولانا سلطان الحق صاحب نماز کے بعد ہمیں چائے پینے کے لئے روک لیا کرتے تھے اور ہمیں حضرت شاہ جی اور مولانا اصلح صاحب کے درمیان سیاسی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ان دو صحافیوں کے خیالات سننے کا موقع مل جاتا تھا

میں نے مدرسہ عالیہ فتحپوری دلی کے استاد مفتی محمد حنیف دہلوی کے ہاتھ کچھ کتابیں اپنے محترم مولانا انظر شاہ صاحب کو بھیجی تھیں اس موقعہ پر شاہ جی نے مفتی صاحب سے کہا: مولانا اخلاق ہمارے بڑے بھائی کی یادگار ہیں، میں نے اس کے جواب میں شاہ جی کو لکھا۔ شاہ جی! آپ نے ادبًا ہلکا لفظ استعمال کیا میں تو اپنے آپ کو انشاء وتحریر اور قرآن فہمی سے دلچسپی کے معاملہ میں بڑے شاہ جی کا پروردہ سمجھتا ہوں۔

دارالعلوم میں داخلہ کے بعد ایک موقعہ پر حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ نے شاہ جی کو مخاطب کرکے اس ناچیز کے بارے میں فرمایا تھا: یہ دلی کے ہیں، دلی والے ادھر نہیں آتے ہیں، یہ مولانا احمد سعید صاحب کی کرامت ہے جو یہ مولوی صاحب ادھر آگئے، انھوں نے مدرسہ عالیہ میں بڑی محنت سے پڑھا ہے، قاضی سجاد صاحب ان کی تعریف کرتے تھے، اب دارالعلوم میں ان کا آنا ان کے حق میں خدا تعالیٰ کا بڑا انعام ہے۔ شاہ جی! ان کا خیال رکھنا۔

دارالعلوم کے طلباء کی انجمنوں میں ایک انجمن تہذیب الاخلاق تھی جس میں بجنوری طلباء تقریر وتحریر میں حصہ لیتے تھے، بیت الہاجرہ میں قیام کی وجہ سے ہم دلی والوں کا تعلق اسی انجمن سے رہا، قاری حکیم مختار صاحب انجمن کے صدر تھے۔

ایک روز قاری صاحب (امام مسجد مدرسہ) نے مجھ سے کہا مولانا ازہر شاہ قیصر فرما رہے تھے کہ دلی کے مولوی اخلاق انجمن کے جلسوں میں تقریر تو اچھی کرتے ہیں مگر آپ ان سے دیواری اخبارات کے لئے بھی مضمون لکھوایا کیجئے تاکہ انھیں تقریر کے ساتھ تحریر کی مشق بھی ہوجائے۔

حضرت مفتی صاحب کی توجہ فرمائی کا شاہ صاحب نے خیال رکھا اور ہمیشہ رکھا۔

فراغت کے بعد شاہ جی سے میرا ملنا جلنا حضرت مفتی صاحبؒ کے دولت کدہ (دفتر برہان) میں ہوتا تھا، میں نے دارالعلوم ماہنامہ کے لئے مضامین لکھنے شروع کردیئے تھے اور شاہ جی نے دارالعلوم میں انھیں چھاپنے کا اہتمام رکھا تھا۔

میرے مضامین شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ (موضح القرآن) کے علمی اور ادبی لطائف پر مشتمل ہوتے تھے اور یہ لطائف مجھے حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی مجلس ترجمہ سے حاصل

ہو جاتے تھے۔

حضرت شاہ جی کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں اگر توجہ دوں گا تو شاہ صاحب کے اس نادر و نایاب ترجمہ کی بڑی خدمت انجام پائے گی، اس لئے شاہ جی جب مجھ سے دلّی میں مفتی صاحب کے مکان پر ملتے تو تقاضا کرتے کہ شاہ صاحب کے ترجمہ کو توجہ کے ساتھ دیکھا کرو، ہمارے ابا جی (حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ علیہ الرحمہ) شاہ صاحب کے ترجمہ کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ مجھے شاہ جی مرحوم کی اس ترغیب سے بڑی مدد ملا کرتی تھی۔

دارالعلوم کے جھگڑے میں مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نے مجھے ابنائے قدیم کا ناظم بنا دیا تھا اور میرا قیام چند دن دارالعلوم کے مہمان خانے میں رہتا تھا۔ ان نازک ایام میں دارالعلوم کے حضرات میں اگر کسی نے میرا خیال رکھا تو وہ شاہ جی علیہ الرحمہ تھے۔ مرحوم کبھی کبھی گھبرائے ہوئے میرے پاس آتے تھے اور پوچھتے تھے، خیریت ہے نا، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کے حلقۂ ہمدردان کے بعض افراد مجھے آکر ڈراتے تھے، میرا حوصلہ پست کرتے تھے اور وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ایک باہر کا آدمی دارالعلوم کی عظیم ریاست کے معاملات میں شریک ہو، اسی ٹھیکہ داری کے زعم باطل نے یہ انجام دکھایا جو سب کے سامنے ہے۔ لیکن بڑے شاہ جی کا پاک باطن اس قسم کے زعمِ باطل سے محفوظ تھا، وہ میری ہمت بندھایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ شوریٰ کی مجلس میں تنظیم کے بارے میں گفتگو کرنے کیلئے مجھے طلب کیا گیا شاہ جی مرحوم کو پتہ چل گیا، وہ دوڑے دوڑے میرے پاس آئے، میرے ہاتھ سے فائل اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا چلو! میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں، شاہ جی کو اندیشہ تھا کہ راستہ میں شریر طلبہ کہیں میرے ساتھ دست درازی نہ کر بیٹھیں۔ پھر شوریٰ میں بات چیت کے بعد مجھے اپنے ساتھ لائے اور مہمان خانہ میں چھوڑ گئے۔

حضرت مولانا محمد اسلم صاحب فرماتے تھے کہ مولانا اخلاق صاحب! مولانا ازہر شاہ قیصر تمھاری طرف سے بے حد متفکر رہتے ہیں اور ان کے احساسات ہمیں بھی پریشان کر دیتے ہیں۔

میرے مضامین طول طویل ہوتے تھے اور شاہ صاحب ان طویل مضامین کو بھی قسط وار

شائع کرتے تھے بعض حضرات کو اس سے ناگواری ہوتی تھی، چنانچہ ایک روز دفتر جمعیۃ علماء ہند میں مجلس عاملہ کے اجلاس کے موقعہ پر مرحوم قاری محمد میاں صاحب (استاد مدرسہ عالیہ) نے مولانا مدنی علیہ الرحمہ کے سامنے یہ شکایت رکھدی کہ دارالعلوم دیوبند کے معیاری پرچہ میں معمولی درجہ کے مضامین لمبے لمبے شائع کیے جاتے ہیں، اور اس سلسلے میں قاری صاحب نے میرے مضامین کی طرف اشارہ کیا۔

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی) مولانا نے اس میں دخل دیا اور فرمایا۔

اگر ایک شخص دارالعلوم کے فضلاء میں تحریری دلچسپی بیدار کر رہا ہے اور ایک مضمون نگار کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے تو اس میں شکایت کی کیا بات ہے۔ ازہر شاہ میں مولویوں کو آگے بڑھانے کا شوق ہے جو اب ہمارے حلقہ سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔

مجھے یہ ساری گفتگو مجلس عاملہ کے ایک بزرگ ممبر (مولانا نورالدین صاحب بہاری) نے سنائی۔

شاہ جی علیہ الرحمہ کو میں نے اپنے مضمون کی سُرخی میں درویش صفت لکھا ہے اور وہ واقعی باطنی قوت کے آدمی تھے۔

دارالعلوم کے جھگڑوں کے دوران ایک دن فرمایا: میں دارالعلوم کے تعلق سے پیش آنے والی ہر پریشانی میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر حاضر ہو کر خداوند تعالیٰ سے دعاء کرتا تھا اور خدا تعالیٰ حضرت شیخ کے توسل سے دعاء کو درجۂ قبولیت عطا کرتا تھا، لیکن اس موقعہ پر عجیب حالت ہے، میں جب حاضر ہوتا ہوں تو مجھے حضرت کی روحانیت پر انقباض محسوس ہوتا ہے، خدا خیر کرے، نہ جانے کیا ہونے والا ہے؟

شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ موضح القرآن کے علمی اور ادبی محاسن پر میری ضخیم کتاب (محاسن موضح القرآن) پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ جی نے لکھا۔

ہمیں افسوس اور حسرت ہے کہ ایسے علمی اور تحقیقی کاموں کی اس زمانہ میں کھپت نہیں مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی کی یہ کتاب اپنی تحقیق و محنت کے لحاظ سے یقیناً اس قابل ہے

کہ کسی صوبہ کی اردو اکیڈمی اسے درجۂ اول کی کتاب قرار دے کر اس پر مولانا قاسمی صاحب کو انعام دے"۔

شاہ جی کے یہ تعریفی کلمات ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے، چنانچہ مرحوم مولانا سعید الرحمن صاحب علوی ایڈیٹر خدام الدین لاہور پر شاہ جی کے ان کلمات کا اثر پڑا اور ان کی جدوجہد سے پاکستان کراچی کے مطبع ایچ ایم سعید کمپنی (پاکستان چوک کراچی) نے تفسیر موضح القرآن کے نام سے اسے چھاپا۔

افسوس رہا کہ شاہ جی اس وقت تک حیات نہیں رہے ورنہ میں ان کی خدمت میں ایک نسخہ لے کر حاضر ہوتا اور انھیں بتاتا کہ علوی صاحب مرحوم کے قول کے مطابق آپ کے کلماتِ خیر اور آپ کی اپیل نے یہ اثر دکھایا کہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کا یہ ایڈٹ شدہ نسخہ لاکھوں روپے کی لاگت سے عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوا۔

قارئین کہیں گے کہ میں شاہ جی علیہ الرحمہ کی تعریف کر رہا ہوں یا اپنی شان میں قصیدہ کہہ رہا ہوں لیکن دراصل یہ میری شان کا قصیدہ نہیں ہے، خاندان ولی اللٰہی کے اس امام التفسیر کی شان میں قصیدہ ہے جس کی عظمت کی طرف شاہ جی مرحوم نے مجھے متوجہ کیا اور اس میں ان کے والد محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے روحانی تصرف کا اثر تھا جو ان کے خلف الرشید کے توسط سے اس ناچیز کے لئے محرک بنا۔

دلداری اور رواداری شاہ جی کی خصوصیت تھی، ناگوار قضیۂ دارالعلوم کے دوران میں نے ان کی زبان سے فریق ثانی کے بزرگوں کی شان میں حدِ ادب کا جذبہ مکمل طور پر دیکھا، جب کہ بعض حضرات حدِ ادب سے گذر کر اوپر والوں کی شان کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کی محبت میں تو وہ سرشار تھے، بھائی جی، بھائی جی کہہ کر ان کی زبان خشک ہو جاتی تھی، بھائی جی پر تکلیف کی جو کیفیات طاری تھیں وہ ان کا تذکرہ کرتے تھے اور بھائی جی کے ساتھ ان کے دل میں جو عقیدت اور محبت تھی وہ اسے چھپانے پر قادر نہیں تھے لیکن مخالف گروہ کے لئے کوئی گھٹیا بات ان کی زبان پر نہیں آتی تھی۔

مرحوم کی اس صفت رواداری نے ایک موقعہ پر انھیں سخت کش مکش میں بتلا کر دیا تھا۔

یہ واقعہ تھا کشمیر میں شاہ صاحب کے سیمنار کے وقت کا. شاہ جی اس سیمنار کے کنوینر تھے، سیمنار میں ایک تجویز یہ پاس کی گئی کہ کشمیر یونیورسٹی میں حضرت مولانا انورشاہ صاحب علیہ الرحمہ کے نام پر ایک چیر قائم کی جائے اور اس شعبہ کی طرف سے حضرت شاہ صاحب پر تحقیقی کتابیں شائع کی جائیں۔

شیخ عبداللہ نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اس شعبہ کی ذمہ داری کون سنبھالے؟ اس وقت شاہ صاحب کے شاگردوں میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا قاضی زین العابدین دونوں حضرات اس کے اہل تھے اور دونوں ہی اس کے خواہشمند تھے۔

میر واعظ مولوی فاروق صاحب نے اپنے دولت کدہ پر علماء و مشائخ کا ایک اجتماع منعقد کیا، اجتماع میں تقریر کے لئے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے پہلے مولانا اکبرآبادی کو تقریر کی دعوت دی، اکبرآبادی نے موقعہ کی نزاکت کو سمجھ کر ایک نہایت شاندار علمی تقریر کی، موضوع تھا یوروپین دانشوروں کا رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اعتراف۔

اکبرآبادی نے کھڑے ہو کر اس موضوع پر نہایت مدلل اور بلیغ تقریر فرمائی، شاہ جی میرے پاس بیٹھے تھے، بولے، اکبرآبادی نے پالا مار لیا۔

اس کے بعد قاضی صاحب سے مفتی صاحب نے فرمایا: آپ بھی کچھ کہیں گے؟ قاضی صاحب کھڑے ہوئے اور مشکل سے پندرہ بیس منٹ شاہ صاحب کی اجتہادی بصیرت پر تقریر کی۔ لیکن مجمع پر اکبرآبادی کا رنگ چڑھ چکا تھا۔

اب ان میں سے ہر بزرگ نے شاہ جی سے کھانے کے بعد پوچھا: مولانا ازہر صاحب! تقریر کیسی رہی، شاہ جی نے بڑی تعریف کی اور دونوں ہی مقرروں کی الگ الگ حوصلہ افزائی کا فرض ادا کیا، میں نے بعد میں کہا۔ شاہ جی! دونوں بزرگوں کو خوب پگایا، ایک قہقہہ لگایا اور بولے تم نے یہ دلی کا محاورہ خوب استعمال کیا، جانتے ہو یہ لفظ پگانا کیا ہے؟ میں نے کہا اس کی تشریح آپ کر دیں۔ بولے ہاں، پگانا ہندی کا لفظ ہے، اسکے معنی ہیں قیمت ادا کرنا قرض ادا کرنا، اس کی جگہ چکانا بھی بولتے ہیں

یہ دونوں میرے بزرگ اور محسن ہیں، میں نے دونوں کی الگ الگ تعریف کر کے ان کا مجھ پر جو احسان کا اور ایک قرض تھا وہ ادا کر دیا۔

میں جانتا ہوں کہ شیخ بڑے سیاسی گھاگ ہیں یہ کرنے کرانے کے کچھ نہیں، چنانچہ یہی ہوا اور شیخ نے اپنے ہاں کھانے پر بلا کر کہا: آپ حضرات کے اندر اختلاف ہے، کسی ایک عالم پر اتفاق نہیں ہے اس لئے میں بعد میں غور کر کے کوئی فیصلہ کروں گا۔

شاہ جی نے مجھ سے کہا: شیخ نے ہم پر رکھ کر معاملہ کو ختم کر دیا۔ میں نے کہا آپ کنوینر ہیں کسی ایک عالم پر اتفاق ظاہر کر دیں۔ بولے بس یہی میری کمزوری ہے، میں ان دونوں میں سے کسی کی شان میں گستاخی نہیں کر سکتا، خدا کو یہی منظور تھا۔

حضرت مفتی صاحب کے اندر بھی یہی کمزوری تھی، مرحوم اختلافی معاملات میں قطعی رائے دینے سے گریز کرتے تھے۔ ان کی لمبی ہاں، ہاں مشہور تھی نہیں نہیں کے الفاظ سے وہ بہت بچتے تھے، اس معاملہ میں حضرت مفتی صاحب کی یہ فطری کمزوری بھی آڑے آئی، ورنہ مرحوم مداخلت کر کے معاملہ کو نمٹا سکتے تھے۔

بہرحال شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ میں بڑی خوبیاں تھیں، وہ واقعی علماء کے حلقے میں ایک درویش صفت انسان تھے۔

شاہ جی مرحوم کبھی کبھی میرے مضامین میں علمی یا ادبی اصلاح بھی کر دیا کرتے تھے، میں نے ایک مضمون میں شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے تراجم کے درمیان موازنہ کر کے شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ کو شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ پر ترجیح دیدی اس پر شاہ جی نے اصلاح کی

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: فصبر جمیل

سب مل کر اپنے چھوٹے بھائی کو کنویں میں ڈال کر آئے اور یہ بہانا بنایا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا تو بوڑھے باپ نے کہا فصبر جمیل۔

شاہ عبدالقادرؒ نے ترجمہ کیا اب صبر ہی بن آئے، یعنی صبر کے سوا چارہ کیا ہے، شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ترجمہ کیا، صبر بہتر ہے۔

میں نے لکھا کہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ میں مجبوری کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور شاہ رفیع الدین

صاحبؒ نے صبر کی اخلاقی فضیلت بیان کی ہے

شاہ جی نے اس پر نوٹ لکھا:

موقعہ کے لحاظ سے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ ہی بہتر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حضرت یعقوبؑ اپنی لاچارگی کا اظہار فرما رہے ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ باہر والے ستم کریں تو گھر والوں سے فریاد کی جائے، لیکن جب گھر والے ہی زیادتی کریں تو پھر کس سے شکایت کی جائے، باہر والوں سے شکایت کی جائے تو خود اپنی بات خراب ہوتی ہے، لوگ سنکر مذاق اڑاتے ہیں شاہ جی نے بہت اچھی وضاحت کی۔

بہرحال خداتعالیٰ شاہ جی کو ان کے دلی صفت اور مقبول بارگاہ بزرگوں کی رفاقت میں جنت الفردوس کے اندر سرفراز فرمائے، آمین

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی دامت برکاتہم

الوداع اے برادرِ بزرگوار

رخصت اے ادیبِ کشمیر

بالآخر پینسٹھ سالہ زندگی، آٹھ ماہ کی مسلسل اور تکلیف دہ بیماری کے سامنے مغلوبیت کا آخری مظاہرہ بصورت "موت" کر گئی، اس منزل سے ہر ایک کو گذرنا ہے، اور زندگی کے جلتے ہوئے چراغ آخر کار بجھ کر رہتے ہیں، زمانہ نے بارہا دیکھا اور دیکھتا رہے گا کہ صبح کی آمد آمد نے، زندگی کے کچھ پھول کھلائے اور شام کے سناٹوں میں یہ گلہائے شگفتہ مرجھا کر شاخ سے گر گئے، صبح ہوتی ہے تو آفتاب تابانیوں کے ساتھ پوری کائنات پر تسلط جما لیتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ نہ ختم ہونے والی جہانبانی ہے، لیکن شام ہوتے ہوتے یہ مینارۂ نور تاریکیوں کے پردے میں اس طرح گم ہوتا ہے کہ اس کے غلبہ و استیلا کے آثار بھی نہیں ملتے، تاج و تخت کے مالک، سلطنت و حکومت کے فرماں روا جو اپنی عظمتوں کے پھریرے اڑاتے آج آغوشِ گور میں سوتے ہیں، اور جن کے نازک بدن ریشم و حریر کے مہین لباس کو بھی بارِ جسم سمجھتے اب منوں مٹی کے نیچے آسودۂ خواب ہیں، علم کی رفعتیں پیوندِ خاک ہو گئیں، کمالات کی بلندیاں عالم کے ہنگاموں سے جدا، سناٹوں میں گم ہیں، پھر جب یہی ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا تو برادرِ بزرگوار کا حادثہ نہ بزاری روکا جا سکتا تھا اور نہ بزوری اسکے قدموں پر پابندی ممکن تھی، مگر موت تک ایک قلبِ حزیں پر یہ صدمہ ہمالیہ کی طرح کھڑا رہے گا کہ یہ چھوٹا بھائی ان کے

سانحہ کے وقت سینکڑوں میل دور تھا، کاش کہ موت تھوڑا سا اور انتظار کر لیتی، داعیٔ اجل کچھ ہی مہلت دیتا۔ لیکن احکم الحاکمین کا یہ اعلان ہمیشہ فضا میں گونجتا رہے گا۔ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔

راقم السطور اس وقت ۵۵ سال کی عمر سے گذر رہا ہے اس لئے ہوش وحواس کے عالم میں برادرِ بزرگوار کی پچاس سالہ زندگی میرے سامنے ہے۔ ان کی زندہ دلی روبرو ہے، مجلس آرائی یاد ہے، ان کے قہقہے کانوں میں گونج رہے ہیں، باتیں حافظہ میں اس طرح موجود ہیں کہ نہ میں بھلا سکتا اور نہ وہ فراموش ہو سکتیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ میں نے سہارنپور کا پہلا سفر ان کے ساتھ کیا تھا، میں اسے کیسے بھلا دوں کہ ان کی انگلی پکڑ کر میں سہارنپور کے کمپنی باغ سے اچھلتا کودتا گزرا تھا، یہ کیسے فراموش ہو کہ شب کے ابتدائی حصہ میں ان کا کاروانِ عروسی سہارنپور کی جانب رواں دواں ہے، کیا یہ بھولنا ممکن ہے کہ اس دولہا کا یہ قافلہ عروسی رات سہارنپور کے ڈاک بنگلہ میں گذار رہا ہے، اسے حافظہ سے کس طرح کھرچ دوں کہ دن کے دس بجے رامپور منہیاران کے ایک کوٹھی میں انھیں دولہا بنایا جا رہا ہے، نہیں نہیں یہ یادیں موت تک نہیں بھلائی جا سکیں گی، یہ ایک ایک منظر سامنے آکر خون کے آنسو رلاتا رہے گا، ۶۵ سال پہلے ایک امام العصر کے گھر میں انھوں نے زندگی کا پہلا سانس لیا اور ٹھیک ۶۵ سال بعد اسی مولد میں آخری سانس لے کر رخصت ہو گئے، رخصت رخصت اے برادرِ بزرگوار الوداع۔ الوداع اے صحافی نامور۔

ذرا اس دنیا کو دیکھئے اس جانگداز حادثہ پر مجھے دس روز تک مطلع نہیں ہونے دیا، ستم بالائے ستم دن میں دس بجے جب میں ایک جلسہ سے مخاطب تھا وہیں یہ خبر وحشت اثر میرے کانوں میں پڑی، تاریخ کا یہ عمل بھی حیرت انگیز ہے کہ ۴۵ سال پہلے ٹھیک دس بجے انکو دولہا بنا دیکھا تھا اور اب میرے سامنے تصوراتی کائنات میں ایک کفن پوش نیم جاں وناتواں جسم ہے۔ دردمند دل سمجھیں گے کہ بھائی کی موت، بڑے بھائی کا سانحہ اور حادثہ کے وقت عدمِ موجودگی ودسرے ملک میں اس کی اطلاع اور مسافرت کے عالم میں اس خبر کا کانوں میں پڑنا، دل ودماغ کے لئے کیا صاعقہ اور قلب وروح کے لئے کیا حادثہ ہو گا؟

انھیں سینکڑوں شعر یاد تھے اور بے تکلف مجلسوں میں وہ ہر موضوع پر سناتے لیکن آج میں انھیں سناتا ہوں۔ ؎ جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے۔

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ابھی ان کی طفولیت تھی کہ والد مرحوم کے ساتھ کئی اسفار میں رفاقت کی سعادت نصیب ہوئی، پنجاب سے تا کشمیر، دیوبند سے تا بمبئی وہ اپنے عظیم باپ کے رفیق سفر رہے، ڈابھیل کے جامعہ میں حصولِ علم کی منزلیں طے کیں، دیوبند میں جناب قاری عبدالحق صاحب اور قاری یامین صاحبؒ سے حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کی، خلافت کی تحریک میں بچپن میں حصہ لیا، دیوبند کے کئی جلسوں میں تقریریں کیں، کمسنی میں قلم و قرطاس سنبھالا۔ انجمنیں بنائیں، قلمی رسالے نکالے اور بہت سی منزلوں سے گذرتے ہوئے ایک نامور صحافی اور ایک مشہور ادیب بن گئے، ان کے قلم پر انشار غالب تھی، اسلوب کی شوکت، تعبیر کی ندرت، الفاظ کی حاکمیت، مضمون کی آمد، ذکاوت کی گلکاریاں، ذہانت کی چمن آرائی، فصاحت کے چشمے اور بلاغت کے آبشار نثار ہونے کیلئے تیار رہتے، غیر منقسم ہندوستان کے مجلات، اخبارات و جرائد میں ان کے مضامین و مقالات خوب چھپتے، "صدیق اکبرؓ" "صداقت اسلام" نامی دو کتابیں اس وقت شائع ہو چکی تھیں جب عمر کی بیسویں منزل میں بھی قدم نہ رکھا تھا، سہارنپور کا اخبار "صداقت" یہیں کا اخبار "غریب" ان کی قلمکاریوں کی ابتدائی منزل تھی، اخبار "مدینہ"، "الامان"، "وحدت"، "تیج ویکلی"، "زمیندار"، "انقلاب"، "شہباز" "عصرِ جدید" ان سب میں قلم کا شباب و بانکپن نکھر کر سامنے آیا، پھر بہت سی کتابیں بھی قلم سے نکلیں، عقائد میں ایسا استحکام کہ اس پر رشک آئے، زندہ دلی زندگی کا دوسرا عنوان، احباب کی مجلس صبح و شام کا شغل، قہقہوں کی بھرمار، دلچسپ لطیفوں کا انبار، مشاہیر کی سوانح و واقعات نوکِ زبان پر رہتے، گھر میں کیسا ہی حادثہ پیش آئے زندگی کے نشیب و فراز کتنے ہی کٹھن ہوں، مگر جب وہ رسالہ "دارالعلوم" کے دفتر میں جا پہونچتے تو دامن اس طرح جھٹک لیتے کہ رنج و غم کا غبار بھی باقی نہ رہتا، اصابتِ رائے میں منفرد، نپے تلے فیصلہ کرنے کے خوگر، اور پھر جس راہ پر چلتے تو بصیرت ہم رکاب رہتی، آج ان کا بڑے سے بڑا مخالف اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ تقریباً چالیس سال انھوں نے دارالعلوم کے اس ترجمان کو جو مجلہ "دارالعلوم" کے نام سے منظرِ عام پر آیا

تھا پوری آب وتاب اور آن بان کے ساتھ چلایا، حالانکہ اسی مجلّہ کی ادارت پر بہت سے مشہور صحافی، بہت سے معروف قلم کار کامیاب نہ ہوسکے تھے۔ انھیں والد مرحوم حضرت علامہ سید انور شاہ الکشمیری کی ذات سے عشق تھا اور باپ کی ایک ایک چیز کو محفوظ رکھتے اور نگارشات میں کسی بھی عنوان سے محبوب باپ کا ذکر کرجاتے۔ مجھے یقین ہے کہ یہی عشق ذریعۂ نجات اور وسیلۂ مغفرت ہوگا۔

انھیں خوش قسمتی سے بچپن میں بعض نادرۂ کار شخصیتوں کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ مفتیٔ اعظم پاکستان، سے قرب اور گہرا تعلق رہا، علامہ عثمانیؒ نے ایک دو بار تراویح میں قرآن بھی سنا، اور ان کی نگارش پر اصلاح بھی فرمائی۔ علامہ عثمانیؒ کی وہ تحریک جس کا تعلق اصلاحِ دارالعلوم سے تھا مرحوم بھائی اس کے خاص رکن تھے۔ چھوٹوں کے ساتھ معاملہ شفقت ومحبت کا تھا، فہیم ہونے کی بنا پر عاقلانہ فہمائش اور مدبرانہ مشورے دیتے، ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کا جوہر بے پناہ رکھتے، بہت سے نوجوان نثر نگاری میں ان سے مستفید ہیں، مراسلت کا سلسلہ بڑا لمبا چوڑا تھا، بہت سی نامور شخصیتوں سے خط وکتابت رہتی، غیر منقسم ہندوستان کے اکثر ادیب وشعراء زمرۂ احباب میں تھے۔

تقریر اگرچہ ان کا پیشہ نہیں تھا مگر اس میدان میں بھی عاجز نہ تھے، جب کھڑے ہوتے تو رواں رواں بولتے محسوس ہوتا کہ الفاظ کا ذخیرہ سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہے سفر سے طبیعت بے پناہ کارہ تھی، مظفر نگر اور سہارنپور کے اسفار کو بھی انگلینڈ وامریکہ کا سفر سمجھتے، کوئی سفر کے لئے کہتا تو پہلے اعذار پیش کرتے۔ ان کے پیش کردہ اعذار کو توڑا جاتا تو تنگ آکر سفر سے اپنا مزاجی عجز صاف صاف کہہ دیتے،۔ لیکن اجلاس صد سالہ کے موقعہ پر بڑی لگن اور مستعدی کے ساتھ دور دراز کے اسفار کئے۔ باوجودیکہ وہ دارالعلوم کے رسمی فاضل نہ تھے لیکن دارالعلوم سے عشق رکھتے اور اس کے موجودہ جدائی کو اتنا محسوس کیا کہ یہی غم والم جان لیوا بن گیا۔

بہرحال یہ ۶۵ سالہ زندگی جو اپنی خصوصیات میں یگانہ اور امتیاز میں یکتا تھی اب

گوشۂ لحد میں ہمیشہ کے لئے جا سوئی، خدا تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے۔ ان کے دامن میں جو حسنات تھے انھیں کو ان کے لئے وسیلۂ نجات بنائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیقِ ارزانی ہو۔ سوگوار قلم اشکبار آنکھیں اپنے مرحوم بھائی کے تودۂ خاک پر کھڑے ہو کر ہمیشہ یہ کہتی رہیں گی۔ "الوداع الوداع اے برادرِ بزرگوار، رخصت رخصت! اے شہسوارِ صحافت"۔

تغمد اللہ بغفرانہ ورحم اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ ابویہ۔

جوارِ رحمت میں

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی

پرانے لوگ تیزی کے ساتھ اٹھتے جا رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے بہت جلد پرانی بساط سمٹ جائے گی اور صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو آزاد ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

غلام ہندوستان علم و فن کے اعتبار سے بہت نمایاں تھا، ملک غلام تھا، باشندے غلام تھے اور ہم سب مل کر ملک کی آزادی کے لئے انگریزی اقتدار سے دست و گریباں تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ذہن و فکر اور دل و دماغ آزاد تھے، سوچنے سمجھنے کی طاقت عروج پر تھی اور یہاں کے باشندوں میں حق و صداقت کے لئے جان دینے کی بے انتہا جرأت تھی، خوف اور خدشہ سے ان کا ذہن پاک و صاف تھا، علم و فن سے نوجوانوں کو خصوصی لگاؤ تھا، علمی کمالات کا گھر گھر تذکرہ تھا اور لکھنے پڑھنے کا ذوق نکھرا ہوا تھا، چودھویں صدی ہجری نے بڑے بڑے باکمالوں اور باذوق ادیبوں، شاعروں، صوفیوں، تاریخ دانوں اور علماء و مشائخ کو پیدا کیا ہے۔

ہمارے بڑے شاہ جی ؒ بھی اسی دور کی پیداوار تھے، قوی الحافظہ، غضب کے ذہین و ذکی اور بزرگوں کے بہت سارے واقعات کے حافظ تھے، انھوں نے ذہانت و ذکاوت اور قوتِ حافظہ اپنے والد بزرگوار سے ورثہ میں پائی تھی، میری مراد محدث العصر، استاذ المحدثین، زندہ لائبریری اور دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

میں نے حضرت محدث کشمیری ؒ کو دیکھا نہیں البتہ اپنے استاذ محترم سے ان کے فضائل و مناقب سنے ہیں، لیکن بڑے شاہ جی کو دیکھا تھا، ان کی مجلسوں میں بیٹھا کرتا تھا ان کی باتیں سنتا تھا اور ان کے حافظہ کی داد دینے پر مجبور رہتا تھا، اور ان کی ذہانت و ذکاوت دیکھ کر ان کی مدح و ستائش پر خوشی محسوس کرتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند سے رسالہ" دارالعلوم" نکلتا تھا اور اب بھی نکل رہا ہے، میں جہاں دوسرے رسائل واخبار منگواتا تھا، رسالہ دارالعلوم بھی منگوایا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں دیوبند سے بہت دور صوبہ بہار کے مشہور ضلع مونگیر کے نامی گرامی قصبہ سانحہ میں ملازم تھا، اس زمانہ میں دارالعلوم معینیہ کی صدارت تدریس میرے ذمہ تھی۔

سب سے پہلے اسی رسالہ سے شاہ جی کا تعارف ہوا میرے مضامین ومقالات رسالہ برہان دہلی وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے میرے مقالات شاہ جی کی نظر سے گذرتے ہوں گے، انھوں نے ازراہ بندہ نوازی مجھے خط کے ذریعہ یاد فرمایا اور رسالہ دارالعلوم کیلئے مضمون بھیجنے کی فرمائش کی، اس وقت میں جوان تھا اور لکھنے اور مطالعہ کی بھرپور طاقت تھی، بہت سارے مضامین لکھ کر شاہ جی کی خدمت میں بھیجتا رہا اور وہ اسے اپنے رسالے میں شائع کرتے رہے اسی زمانہ میں سوانح قاسمی کی جلدیں شائع ہوئیں تو انھوں نے اس کی پہلی جلد میرے پاس بھیجی اور حضرت نانوتوی رہ پر تاریخ حقائق لکھنے کا حکم فرمایا، برہان دہلی میں اس عنوان پر میرے بہت مضامین شائع ہو چکے تھے، چنانچہ میں نے اس جلد کو پڑھ کر تاریخی حقائق مرتب کئے اور انکو بھیجا جسے انھوں نے چار قسطوں میں شائع کیا۔ قارئینِ دارالعُلوم نے اس سلسلہ کو بہت پسند کیا،

یہاں سے شاہ جی سے میرے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے، دو چار سال بعد دارالعُلوم میں ایک جگہ خالی ہوئی اور دارالعُلوم۔ نے چاہا کہ اس پر کسی باذوق عالم کا تقرر کرے شاہ جی کو میرے مضامین ومقالات کی وجہ سے مجھ سے اُنس پیدا ہو چکا تھا، اس جگہ کے لئے جہاں دوسروں کو دارالعلوم سے خط لکھا گیا خاکسار کے نام بھی ایک لمبا خط اس زمانہ کے مہتمم حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے دستخط سے میرے پاس پہنچا اور اس جگہ کے لئے خود مجھ سے میری رائے معلوم کی گئی، یہ واقعہ ہے کہ جو شرائط اس میں درج تھے ان کو پڑھ کر میں دنگ رہ گیا اور میں نے جواب میں لکھ دیا کہ میں ایک معمولی مدرس ہوں اس کے سوا مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے کہ پڑھنے لکھنے کا مجھ میں فطری ذوق ہے۔

شاہ جی دارالعلوم اور اس کے مزاج سے واقف تھے انھوں نے لکھا کہ تم بھاگو نہیں اس جگہ کو قبول کر لو تم اس ذمہ داری کو بسہولت نباہ لوگے، اور اس سلسلہ میں کئی خط لکھ کر مجھے مطمئن

کرنے کی سعی فرماتی۔

بہر حال مقدر تھا میں ۳ رصفر ۱۳۷۶ھ کی صبح میں دارالعلوم حاضر ہوگیا اور جگہ سنبھال لی، یہ پہلا دن تھا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے شاہ جی کو دیکھا، ان سے باتیں ہوئیں، تبادلہ خیال ہوا، اور اس پر شاہ جی نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا، اس زمانہ میں میرا زیادہ اٹھنا بیٹھنا شاہ جی کے پاس ہی ہوا کرتا تھا، چھوٹے شاہ جی سے بھی ملاقات ہوئی اور ان سے بھی کچھ دنوں اچھا خاصہ رابطہ رہا۔

بڑے شاہ جی ؒ ربع صدی کی تاریخ کے تقریباً حافظ تھے اور اس دور کے تمام علماء کرام کو دیکھے ہوئے اور ان کے حالات سے پورے طور پر واقف تھے، انداز بیان شاہ جی کا مؤثر ہوا کرتا تھا، کچھ دنوں بعد شاہ جی ہم لوگوں کے میر مجلس بن گئے، ان کے مستقل ارکان میں مولانا محبوب رضوی مولانا عبدالحق پیشکار، اور یہ خاکسار تھا، لیکن دوسرے بہت سارے اہل علم بھی جمع ہو جاتے تھے، اور کہنا چاہیئے ایک گھنٹہ یہ اچھی خاصی علمی مجلس ہوتی تھی، عام معلومات کا ذخیرہ شاہ جی کے پاس تھا، تاریخی معلومات پر گوہر افشانی مؤرخ اسلام مولانا محبوب رضوی کیا کرتے تھے اور قرآن وحدیث کی بات آتی تھی تو اس پر مولانا عبدالحق دادِ تحقیق دیا کرتے تھے، کوئی سیاسی موڑ آتا تو خاکسار اس پر روشنی ڈال دیا کرتا تھا، اور شاہ جی نے ڈانٹ کر کسی مسئلہ پر رائے پوچھی تو اس پر اظہار رائے بھی کر دیا کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ میرے غائبانہ میں شاہ جی مجھے علم کے باب میں کبھی کبھی بخیل کہہ دیا کرتے تھے۔

لوگ علمی موضوع پر گفتگو سے تھک گئے تو اب شاہ جی نے ایسے قصے چھیڑ دیئے کہ سن کر ہنستے ہنستے ہم لوگ بے خود ہو جایا کرتے۔

شاہ جی ؒ میں کینہ کپٹ قطعاً نہیں تھا، اگر کبھی کوئی ناگواری ہوئی تو محض وقتی طور پر، صاف دل تھے اور محبت وتعلق رکھنے والے آدمی تھے، اور تعلقات کو نباہنا جانتے تھے۔

حضرت حکیم الاسلام ؒ کے دور اہتمام تک دارالعلوم میں شاہ جی کو بہت اچھا اثر ورسوخ حاصل تھا، ممبران شوریٰ سے ان کے تعلقات مضبوط تھے، ان میں بہت سارے ممبران شوریٰ ان کے ابا کے شاگرد تھے اور وہ شاہ جی کا ان کے صاحبزادہ اور استاذ زادہ ہونے کی حیثیت سے پورا دھیان رکھتے تھے بلکہ احترام کرتے تھے، اور شاہ جی جو کچھ چاہتے کرا سکتے تھے مگر تیس سالہ ہم نشینی کا مجھے تجربہ ہے کہ بڑے شاہ جی نے کبھی کسی کو نقصان پہونچانے کا ارادہ تک نہیں

کیا فائدہ تو بہتوں کو پہنچایا، آج بھی ایسے بہت سارے لوگ زندہ ہوں گے جن کی انھوں نے بھرپور مدد کی ہے اور اندر و باہر سے ان کی مدد کی اور کرائی ہے۔

شاہ جی ؒ میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اہلِ علم کا احترام کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ان کے علم کی تعریف کیا کرتے تھے اور سامنے حوصلہ افزا کلمات فرماتے تھے، جس خوبی کی آج بڑی کمی ہے جب کوئی غمزدہ صورت بنا کر ان کی مجلس میں آتا تو پھر اسے ایسے باغ و بہار فسانے سناتے کہ وہ بھی باغ باغ ہو جاتا اور تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنا سارا غم بھول جایا کرتا تھا۔

غالباً ۱۳۸۲ھ کی بات ہے کہ رسالہ دارالعلوم میں "حرفِ آغاز" نہ ہونے کا تذکرہ زبانوں پر آیا، مجلس شوریٰ نے اداریہ نہ ہونے کو رسالہ کے لئے ایک بڑی کمی محسوس کی اور اس کے لئے آدمی کا انتخاب شروع ہوا، ان لوگوں میں ایک خاکسار کا نام بھی آیا، مجھ سے بعض بزرگ ممبروں نے رائے معلوم کی، میں نے عرض کیا کہ حضرت: شاہ جی اسے غالباً پسند نہیں کریں گے، اور میں اس لئے بھی ڈرتا ہوں کہ وہ میرے استاذ مدظلہ کے استاذ زادہ ہیں، کبھی ایسا نہ ہو کہ یہ شاہ جی کی خفگی کی وجہ بن جائے، اس لئے معاف رکھا جائے تو بہتر ہے۔

ایک دفعہ ایک چپراسی آیا کہ شوریٰ میں آپ کو بلایا جا رہا ہے، فوراً چلیں، مرتا کیا نہ کرتا ڈرتا اور سہما ہوا چلا اور سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا، اللہ تعالیٰ رحم کرے، دفتر اہتمام میں پہنچا تو سارے ممبران بیٹھے نظر آئے، میں جا کر ادب سے بیٹھ گیا، ایک ممبر محترم نے پوچھا، آپ رسالہ دارالعلوم پڑھتے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں پڑھتا ہوں۔ اس میں اداریہ ہوتا ہے؟ میں نے کہا نہیں ہوتا ہے۔ فرمانے لگے، اس کی ضرورت ہے؟ عرض کیا، اس کا فیصلہ تو آپ حضرات فرمائیں گے، دوسرے ممبر محترم نے فرمایا، اس کی ضرورت ہے اور اداریہ ضرور ہونا چاہیئے۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ یہ ذمہ داری آپ پر ڈالی جا رہی ہے، اور ایڈیٹر کے ساتھ آپ کا نام بھی ہوگا، ٹائیٹل پر دو نام ہوں گے، میں نے ادب سے عرض کیا کہ حرف آغاز کا جہاں تک تعلق ہے، اس کے لئے اپنے کو آمادہ پاتا ہوں اگر شاہ جی پسند کریں، لیکن ٹائیٹل پر اپنا نام مجھے قطعاً پسند نہیں ہے، آئے ہوئے مضامین پر نظر ثانی کی ذمہ داری بھی لے سکتا ہوں، ایک معزز ممبر نے میری حمایت فرمائی اور کہا کہ مناسب یہی ہے کہ ان کے ذمہ صرف حرفِ آغاز کا لکھنا

رہے اور آئے ہوئے مضامین پر نظر ڈال لینا، پھر انھوں نے ہی کہا کہ شاہ جی آپ کے نام پر اتنے کام کے لئے راضی ہیں، بات طے پا گئی میں اٹھ کر چلا آیا، مگر ڈرتا رہا، شاہ جی رح نے بلا کر کہا تم حرفِ آغاز لکھ دیا کرو، اور اس سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لیا کرو، میں نے عرض کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔

کم و بیش بیسؔ سال میں نے رسالہ دار العلوم کا شاہ جی کی ادارت کے زمانے میں "حرفِ آغاز" لکھا اور کبھی بھی اس معاملہ میں شاہ جی کا مجھ سے اختلاف نہیں ہوا بلکہ پیچھے سراہا، اگر کبھی میں رخصت پر وطن چلا گیا اور کسی دوسرے نے حرفِ آغاز تحریر کیا تو وہی باعثِ نزاع اور وجہ شکوہ و شکایت بن گیا۔

اس سلسلہ میں میرے ذوق سے شاہ جی کا ذوق ملتا جلتا تھا کہ لڑائی جھگڑے کی کوئی بات ہرگز نہیں ہونی چاہئے اور نہ کسی کی ذات پر کوئی تنقید ہونی چاہئے، بیس سال کی اس شرکت میں ایک لمحہ کی رنجش نہ ہونا یہ حضرت شاہ جی کی سلامتی طبع کی دلیل ہے، یقیناً وہ سلیم الطبع تھے، کبھی کبھی غصہ ضرور آتا تھا مگر بہت تھوڑی دیر کیلئے، اور جو کچھ کہنا ہوتا کہہ دیا کرتے تھے، دل میں پال کر اسے توانائی نہیں بخشتے تھے۔

ممبرانِ شوریٰ کے علم و فضل کے قائل تھے اور یہ اپنے ابا کے تلامذہ کی توبیحد قدر کرتے تھے اور ساتھ ہی تعریف بھی، ان میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رح، حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح سے بہت گہرا تعلق تھا، کہتے تھے کہ ڈابھیل میں جب وہ پڑھتے تھے یہ دونوں بزرگ میری ناز برداری کیا کرتے تھے، میں بہت کم سن تھا اور کوئی بات ہوتی تو ابا انھیں بزرگوں سے فریاد کیا کرتے تھے، اسی کے ساتھ یہ بھی شاہ جی فرماتے تھے کہ ان دونوں بزرگوں نے ہر دور میں میرے گھر کی خبر گیری کی اور گھر پر آکر اماں جی کو سلام کیا کرتے تھے، اماں جی ان دونوں کو بہت مانتی اور چاہتی تھیں۔

استاذ محترم حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کے علم و فضل پر شاہ جی کو فخر تھا اور کہتے تھے کہ ابا جی ان کو اہل علم مانتے تھے اور ان کی صلاحیت کے لئے ایک خاص جملہ فرمایا تھا۔

کبھی کبھی اپنی مجلس میں کہا کرتے تھے کہ ابا جی کے شاگردوں کے خلاف کوئی جملہ منھ سے نکالنا پسند نہیں کرتا ہوں۔

شاہ جی رح امیر شریعت مدظلہٗ کی بھی اپنی مجلس میں کافی تعریف کرتے تھے اور اس پر خوشی کا

اظہار کرتے تھے۔ ایک دو دفعہ میں نے کسی سلسلہ میں ان سے سفارش کی تو انھوں نے اباجی کے تعلق سے میری بات رکھ لی، حالانکہ وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔

مولانا ڈاکٹر مصطفٰے علوی کے سلسلہ میں اپنی بعض مجلسوں میں بتایا کہ وہ پرانے انداز سے مجھے بطور نذرانہ یا ہدیہ کچھ روپے دیا کرتے ہیں اور انداز نیاز مندانہ اختیار کرتے ہیں، حالانکہ علم و فضل اور عمر میں مجھ سے بہت بڑے ہیں اور مجھے ان کی اس ادا پر شرم آتی ہے، مگر کیا کیا جائے وہ فرماتے ہیں کہ تم میرے استاد زادہ ہو تمھارا اکرام میرے فرائض میں داخل ہے۔

شاہ جی رح بظاہر اوراد و وظائف کے قائل تھے نہ پابند مگر جب کبھی اللہ رب العزت کی رحمت و بخشش پر بولنے لگتے تو بڑے مؤثر انداز میں فضل و کرم اور اس کی رحمت و رافت کو بیان کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت وہ مرشد کی مسند پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

شاہ جی رح کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی مایوسی اور ناامیدی کی گفتگو نہیں کرتے تھے، اور نہ ایسی باتیں جس سے کسی کا حوصلہ پست ہو بلکہ حوصلہ افزا کلمات سے دوستوں اور ساتھیوں کو نوازتے تھے۔

شاہ جی رح کی طبیعت باغ و بہار تھی، خود بھی خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش وخرم دیکھنا چاہتے تھے، مجلس میں کبھی اداسی کو قدم ڈالنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، ان کی گفتگو بڑی ہی دلچسپ ہوا کرتی تھی، ان کی لمبی باتوں کو سنکر بھی کوئی گھبراتا اور اکتاتا نہیں تھا

ایک زمانے میں شاہ جی کی زبان پر دانے نکل آتے تھے اور کافی کمزور ہو گئے تھے، بیمار چل رہے تھے مگر اس زمانہ میں بھی خوش طبعی میں کوئی فرق نہیں آیا، ایک دن گھر سے دفتر آئے تو کہنے لگے کہ انشاء اللہ اب اچھا ہو جاؤں گا، پوچھا گیا: کیا بات پیش آئی آج ماشاء اللہ آپ خلاف توقع ادھر ایک دو ہفتہ کے بعد بہت خوش وخرم نظر آرہے ہیں، کہنے لگے بھائی موت کا فرشتہ ایک حسین لڑکی کی شکل میں آیا تھا اور اس نے سنایا کہ تم کو چلنا ہے، میں نے معذرت پیش کی اور اپنی مجبوری بیان کی اور کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے مہلت دلاؤ، آج رات میں پھر وہ حسین لڑکی خواب میں آئی تھی اور یہ بشارت سنا گئی کہ تمھاری درخواست اللہ تعالیٰ نے قبول کرلی ہے، اپنے انداز میں اس خواب کو بڑی خوبصورتی سے سنایا، ساتھیوں نے

کہا شاہ جی پھر تو آپ کی عمر بڑھ گئی فکر کی بات اب نہیں رہی۔
واقعی وہ اس کے بعد بتدریج صحتیاب ہو گئے اور بیماری جاتی رہی، بعد میں بھی دوستوں کو یہ قصہ کبھی کبھی دوبارہ سناتے تھے۔

ادھر تین چار سال سے جب سے دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کر لی تھی ان کی صحت بہت متأثر رہنے لگی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر فدا تھے، جہاں حضرت مہتمم صاحب کا ذکر آتا ان کی آواز دفعۃً بھرّا جاتی اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور بے اختیار آنسو کے قطرات ٹپکنے لگتے تھے، دسیوں مرتبہ میں نے اپنے سامنے شاہ جی کو حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر روتے اور ہچکیاں لیتے دیکھا، میں دل میں سوچتا بھی تھا کہ شاہ جی کتنے مضبوط دل و دماغ کے تھے کبھی ان کی آواز کو بھراتے دیکھا اور نہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے، آخر ان کو کیا ہو گیا، جب ذرا تسکین ہوتی تو حضرت مہتمم صاحبؒ کے دسیوں واقعات بیان کرتے اور ان کی ملی اور دارالعلوم کی خدمات پر روشنی ڈالتے اور کہتے کہ ایسا مہتمم دارالعلوم کو پھر کبھی شاید میسر نہ آسکے گا۔
ایک عرصہ سے سبھوں سے میں نے ملنا جلنا تقریباً ترک کر رکھا ہے، مگر شاہ جی جب خبر بھیجتے ان کے یہاں چلا جاتا، مغرب کی نماز عموماً اپنے گھر میں پڑھتے، امام مجھے بناتے، کوئی دوسرا ہوتا تو وہ رخصت ہو جاتا، میں چلنے لگتا تو زبردستی روک لیتے اور رات گئے دیر تک باتیں کرتے رہتے، علمی گفتگو بھی کرتے اور دنیاوی و سیاسی حالات پر بھی بحث کرتے، ان کی گفتگو کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی، شیریں بیان تھے اور اندازِ گفتگو بہت پیارا ہوا کرتا تھا، آدمی شاہ جی کی مجلس سے یہ سوچتے ہوئے اٹھتا کہ کاش کچھ دیر مجلس اور رہتی۔

ان کی یہ خوبی بھی تھی کہ اگر کسی کے تاریک پہلو پر نظر ڈالتے تو ساتھ ہی اس کے روشن پہلو کو بھی ضرور بیان کرتے اور سراہتے، طبیعت مرنجاں مرنج پائی تھی، کبھی کسی سے ٹوٹ کر بات نہ کرتے تھے، میں کبھی زمانہ کی رفتار سے اپنی پریشانی ظاہر کرتا تو شاہ جی اس وقت بڑے امید افزا کلمات سے نوازتے اور میری خدمات گنا کر کہتے کہ تم تو کام کے آدمی ہو، تم نے اپنی زندگی میں بہت سارے کام انجام دیئے ہیں، متعدد تصانیف تمہاری ہیں اور ساری کی ساری عالمانہ فقیہانہ انداز کی ہیں پھر کیوں پریشان ہوتے ہو، اللہ تعالیٰ تم کو ضائع نہیں ہونے دیں گے، شاہ جی کی اس وقت

باتیں سنکر میں بھی تھوڑی دیر کے لئے دھوکے میں آجاتا اور مجھے لگتا کہ میں بھی واقعی مولوی ہوں اور میں نے بھی کچھ کام کیا ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا، حالانکہ میری حیثیت ایک معمولی طالب سے زیادہ نہیں۔

شاہ جیؒ جس دن خوش ہوتے مختلف شاعروں کے اشعار بھی سنایا کرتے تھے اور کوئی شبہ نہیں ان کو اشعار بہت کافی یاد تھے اور برجستہ پڑھتے چلے جاتے تھے، بہت سے شاعروں کی زندگی اور زندگی کے مختلف گوشوں پر بھی روشنی ڈالتے تھے، شاہ جی خود بھی اشعار کہتے تھے اور بہت عمدہ کہتے تھے اور کبھی سنایا بھی کرتے تھے۔ ان کا ذہن ایسا معلوم ہوتا ہے ہر وقت حاضر رہا کرتا تھا کبھی غائب نہیں دیکھا، اس یکسوئی کے زمانہ میں کبھی کبھی برجستہ اشعار کہتے تھے اور مجھے سناتے بھی تھے۔

بات کرنے اور اپنی بات دوسروں کے ذہن میں اتارنے کا خاص ملکہ تھا بلکہ اندازِ بیان ایسے موقع پر اور زیادہ شگفتہ ہوجایا کرتا تھا، ایک زمانہ میں دارالعلوم میں بوڑھوں کو ریٹائر کرنے کی تجویز کا تذکرہ زوروں پر تھا، ایک دفعہ ملازمین وفد کی شکل میں حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ترجمان شاہ جی کو بنایا گیا کہ وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ذرا بے تکلفی سے باتیں کرلیا کرتے تھے، شاہ جی نے وہاں بڑی جچی تلی اور مؤثر گفتگو کی اور ملازمین کی ترجمانی کا فریضہ حسن وخوبی سے ادا کیا، مہتمم صاحب متأثر ہوئے اور فرمایا اچھا میں آپ حضرات کی باتیں شوریٰ میں رکھوں گا۔

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ واقعی وہ ہماری تکلیفوں سے متأثر ہیں تو اب شاہ جی نے ہنسنے ہنسانے کی بات چھیڑ دی، کہنے لگے: بھائی جی! یہ لوگ تو علماء کرام اور پڑھے لکھے ہیں یہ تو ممکن ہے ریٹائر ہونے کے بعد اپنا کچھ انتظام کرلیں، دارالعلوم پنشن تو دیگا نہیں میں تو کوئی زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں، درس وتدریس کا فریضہ انجام دے نہیں سکتا، ریٹائر ہونے کے بعد ساگ کی ٹوکری لے کر حضرت کے مکان کے دروازے کے سامنے سڑک پر بیٹھ جاؤں گا اور اسے بیچ کر گذارہ کرنے کی کوشش کروں گا، سارے لوگ یہ سنکر کھلکھلا کر ہنسنے لگے، حضرت مہتمم صاحبؒ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے، اور اسی طرح اور بھی چٹکلے بیان کرتے رہے۔

اسی سال کے ابتدائی حصہ میں غالباً اخیر مارچ ۸۵ء میں شاہ جی پر ہارٹ اٹیک ہوا، مجھے معلوم ہوا تو میں اور حکیم عزیزالرحمٰن صاحب دونوں بعد مغرب شاہ جی کی خدمت میں ان کے گھر حاضر ہوئے، اس وقت ان کو تھوڑا سکون تھا، ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگے کہ بھائی جی یعنی حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ غالباً اپنے پاس بلانا چاہتے ہیں، مولوی عبدالحق پہنچ چکے ہیں، تنہا اس کا جی نہیں لگ رہا ہے، میری ضرورت محسوس کر رہا ہے، بس ایسا معلوم ہوتا ہے اب میری باری بھی آچکی ہے۔

ہم لوگوں نے کہا شاہ جی ایسا نہیں ہے، ابھی تو آپ بہت دنوں تک ہم لوگوں میں رہیں گے مگر بار بار یہی کہتے رہے کہ نہیں ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جانا ہی پڑے گا، پھر اپنے اشعار سنانے لگے اور اس وقت خوشی سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا، کوئی گھنٹہ بھر شعر و شاعری شاہ جی کی چلتی رہی ہم سنتے "اور کچھ عرض" کہتے رہے۔

دوسرے دن بعد عصر پھر ہم دونوں حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ رات میں طبیعت پھر بگڑ گئی تھی لوگ انھیں بذریعہ کار مظفر نگر لے گئے تاکہ کوئی معقول علاج ہو سکے، گھر کے بچے آبدیدہ اور غمزدہ نظر آئے، اس کے بعد برابر بیمار ہی رہے، درمیان میں کچھ اچھے ہو گئے تھے اور مزہ سے چلنے پھرنے لگے تھے مگر پھر صحت گر گئی۔

کیا معلوم تھا کہ شاہ جی کی بات صحیح ثابت ہوگی، یہ بیماری دن بدن بڑھتی رہی اور مسلسل آٹھ ماہ بیمار رہے۔

۲۷ نومبر ۸۵ء کو قبیلِ عصر معلوم ہوا کہ شاہ جی آج ساڑھے تین بجے دن میں چل بسے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

صاحبزادہ
حکیم الاسلامؒ
مولانا محمد اسلم
قاسمی صاحب

احباب کا رخصت ہو جانا بڑا سخت اور صبر آزما مرحلہ ہے، اور پھر احباب بھی ازہر شاہ صاحب جیسے سدابہار اور زندہ دل ـــ جو زندگی بھر روتوں کو ہنساتے رہے، ایک مخلص غمخوار جو ہمیشہ ہر ایک کے غم بانٹتے رہے، سب کے زخموں پر پھاہے رکھتے رہے، اور آخر کار خود رخصت ہوئے تو ایسی ٹیس اور ایسا درد دے گئے جو زندگی بھر ان کے چاہنے والوں کو تڑپائے گا۔

یہ تصور بھی ناقابل یقین لگتا ہے کہ شاہ صاحب ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکے ہیں اور ان کی محفلیں سدا کیلئے اجڑ چکی ہیں، تصور میں جب ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ اور ان کی منفرد خوبیاں ابھرتی ہیں تو کلیجہ منھ کو آتا ہے، یہ بھی قدرتی بات ہے کہ ایسے میں جانے والے کے قریبی ساتھیوں سے ہی مرحوم کی شخصیت اور حیات وخدمات پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا جاتا ہے، لیکن قریبی احباب کیلئے یہ مرحلہ بڑا نازک اور صبر آزما ثابت ہوتا ہے، شکستہ دلی، سینے کی کسک اور ذہنی پراگندگی اس لائق ہی نہیں چھوڑتی کہ بکھری ہوئی یادوں کو سمیٹا جا سکے۔

شاہ صاحب ایک ہمہ صفت موصوف قسم کے آدمی تھے جو ہر طرح کے ماحول اور ہر قسم کے حالات میں اپنے لئے راہیں پیدا کر لینے اور اپنا امتیاز قائم کر لینے کی اہلیت رکھتے تھے، اس کی سب سے مکمل مثال یہ ہے کہ ان جیسے آزاد منش شخص کو جس نے اپنی ابتدائی زندگی بے فکری میں اور انفرادیت پسندانہ مزاج کے ساتھ گذاری تھی، جب اچانک دارالعلوم کے مسلکی ترجمان "ماہنامہ دارالعلوم" کی ادارت سونپی گئی تو مرحوم بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس منصب پر آکر بیٹھ گئے اور پھر پینتیس ۳۵ برس تک جماعت دارالعلوم کے مسلک کی اس طرح پاسبانی واشاعت کرتے رہے کہ جماعت کے سربراہوں کو رسالہ دارالعلوم کے مواد پر کبھی انگلی رکھنے کی گنجائش نہ ہوئی، یہ کوئی معمولی بات

نہیں کہ ایک نو آموز اور جماعتی مزاج کی نزاکتوں سے نا آشنا شخص پوری جماعت کے دینی معتقدات کا ترجمان بن کر روزِ اول سے ہی اس کامیابی کے ساتھ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوتا رہے، شاہ صاحب کی سلامتیٔ طبع اور فکری اعتدال پسندی پر ان کی یہ مسلکی ترجمانی سب سے بہتر دلیل بھی ہے اور ان کے فطری جوہر کا واضح ثبوت بھی۔

شاہ صاحب میں شعر فہمی کا ذوق فطری تھا، مرحوم اکثر خود بیان کیا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک ادیب اور افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا، ممکن ہے ان کے وہ ادب پارے ان کے کتابی ذخیرے میں موجود ہوں، لیکن مجھے ان کو دیکھنے پڑھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، اسی دور میں شاہ صاحب کے سیاسی مضامین کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جو اس وقت کے جرائد میں شائع ہوتے رہے اسی ادبی ذوق نے انھیں تقسیم ملک سے پہلے کے شعراء اور ان کے کلام کی طرف متوجہ کیا، اپنے لاہور کے زمانۂ قیام میں شاہ صاحب اس وقت کے مشہور شعراء کی مجلسوں میں پہنچ گئے اور اپنی خداداد ذکاوت اور سخن فہمی کے طفیل ہمیشہ ان نامور شعراء کے بے تکلف احباب میں شامل رہے احسان دانش اور آغا شورش کاشمیری سے شاہ صاحب کی اکثر مراسلت رہی، جگر صاحب شاہ صاحب کے محبوب شاعر تھے جن سے ان کے ذاتی مراسم بھی تھے، ایک دو مرتبہ جگر صاحب کسی مشاعرہ میں دیوبند آئے تو شاہ صاحب نے اپنے مکان پر انھیں چائے پارٹی دی اور اپنے احباب کو ان سے متعارف کرایا، شاہ صاحب کی سخن فہمی بے مثال تھی، اچھے شعر کی پرکھ ان کا امتیازی وصف تھا، کوئی اچھا شعر کتنے ہی سرسری انداز میں ان کے سامنے پڑھا جاتا تو شاہ صاحب ایک لمحے میں اس شعر کی نزاکت بیان، خیال آفرینی، بندش کی چستی اور طرز ادا غرض ساری خوبیوں کو تاڑ لیتے تھے، اور جھوم جھوم کر اس کی شعری خصوصیات بیان کیا کرتے، یہاں تک کہ احباب کے مجمع میں مجھ جیسے سخن نا آشنا لوگوں کے لئے کسی شعر کی خوبی کا معیار ہی یہ مقرر ہو گیا تھا کہ اگر شاہ صاحب نے داد دیدی تو وہ یقیناً اعلیٰ درجے کا شعر ہوگا، شاہ صاحب خود بہت کم شعر کہتے تھے، لیکن اپنی بہترین قوت حافظہ کی بنا پر بجائے خود ایک ایسا شعری دیوان تھے جس کے سینے میں تمام قدیم و جدید شعراء کا بہترین کلام محفوظ تھا، مناسب حال اور برموقعہ شعر پڑھ دینا، شاہ صاحب کی زبردست خصوصیت تھی، شعری مناسبت اور حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اپنے پسندیدہ شعراء میں سے احسان دانش اور

شورش کاشمیری کی تازہ نظمیں جوان کے آخری دور میں آتی تھیں وہ ایک دفعہ پڑھ کر تقریباً پوری نظم مجمع احباب میں سنایا کرتے تھے۔

ازھر شاہ قیصر آج کوئی شخصیت نہیں صرف ایک نام ہے مگر اس نام کے پیچھے کتنی خصوصیات کتنی خدمات، کتنے کارنامے اور کتنی یادیں پنہاں ہیں اسے کچھ وہی لوگ محسوس کرسکتے ہیں جنھیں اس مخلص اور دردمند انسان کے ساتھ وقت گذارنے کا موقعہ ملا ہے۔ شاہ صاحب سے میرا تعلق تقریباً تیس برس سے تھا۔ اس طویل مدت میں انھیں دوستانہ مجلسوں میں بھی برتا، سنجیدہ اجتماعات میں بھی دیکھا، گھریلو زندگی میں بھی انھیں پرکھنے کا موقعہ ملا، دارالعلوم کے ایک ذمہ دار عہدیدار کی حیثیت سے بھی دیکھا اور ایک لاپرواہ اور پُر مذاق شخص کے روپ میں بھی دیکھا، مگر ان تمام رنگارنگ حیثیتوں میں ایک چیز شاہ صاحب کی شخصیت میں قدر مشترک پائی اور وہ تھی ان کی مخلصانہ وضعداری، ہر محفل میں اپنے قریبی احباب کی دلداری اور ہر مجمع میں اپنے دوستوں کے ساتھ یکساں طرزِ عمل مرحوم کی امتیازی خصوصیت تھی۔

اپنے چھوٹوں کو نمایاں کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں شاہ صاحب نے ہمیشہ انتہائی فراخدلی کا مظاہرہ کیا، جوہر شناسی اور مردم سازی کے معاملے میں مرحوم کو اپنے والد بزرگوار کا مزاجی ورثہ قدرت نے دل کھول کر دیا تھا، شاہ صاحب کے والد ماجد محدثِ کبیر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گوناگوں علمی فیوض کے ساتھ جو چلتا پھرتا علمی ترکہ چھوڑا وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردانِ رشید کا ایک طویل سلسلہ ہے، اس حلقے میں حضرت شاہ صاحبؒ بے مثال علماء، بے نظیر محققین کا ایک زبردست مجمع چھوڑ کر گئے۔ جو ان کے علمی و روحانی فیض تربیت کا مرقع تھا، حضرت کا ہر شاگرد اپنے جلیل القدر استاذ مربی کی شان تربیت کی منھ بولتی تصویر تھا، اس مجمع میں ہم حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ، اور حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ وغیرہم کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحبؒ کو ایک خصوصی شانِ علم و تربیت دے کر اور ایک زبردست

فیض رساں شخصیت بنا کر بھیجا تھا، آسمانِ علم کے یہ سب چاند ستارے حضرتؒ کے فیض تربیت کا جیتا جاگتا نمونہ تھے، پھر جب ہم مرحوم شاہ صاحب کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مردم شناسی اور جذبۂ تربیت ان میں اپنے والد بزرگوار سے منتقل ہوا تھا، فرق یہی ہے کہ شاہ صاحب مرحوم کی شخصیت میں جو ایک مربّی پنہاں تھا اس نے اپنی تربیت سے دنیوی وجاہت کے نمونے تیار کئے چنانچہ جن لوگوں کو شاہ صاحبؒ کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ تھوڑے عرصہ بھی مل گیا وہ اس کے بعد اپنی زندگی کی تعمیر میں اتنے تیز رو ثابت ہوئے کہ بڑے بڑے ذی استعداد نوجوانوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے، اسی لئے رسالہ دار العلوم کا دفتر نوجوانوں کی ایک بہترین تربیت گاہ تھا، ایسی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں کہ جن نوجوانوں کو قدرت نے شاہ صاحب مرحوم کی زیر تربیت و نگرانی پہونچا دیا تو شاہ صاحب کی جوہر شناس نظر نے ان کے مخصوص طبعی رجحانات اور استعدادوں کو پہچان کر ان کی خفیہ اہلیتوں کو بیدار کیا اور ان کی افتاد مزاج کے مطابق ان کی تربیت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی مدت میں ان کے اندر خود اعتمادی و خود شناسی پیدا ہو گئی، یہ جوہر قابل پیدا کرنے کے بعد پھر شاہ صاحب ان نوجوانوں کے سامنے زندگی کی وسیع تر جولان گاہ میں اپنی صلاحیتوں سے کام لینے اور آگے بڑھنے کی تحریک کرتے تھے، اس طرح ان نوجوانوں کو آگے بڑھا کر اگرچہ خود شاہ صاحب کے لئے نت نئی پریشانیاں اور دفتری الجھنیں پیدا ہو جایا کرتی تھیں، کیونکہ اپنے تربیت کردہ نوجوانوں کو زندگی کی وسیع تر شاہراہوں کا راستہ دکھا دینے کے بعد خود دفتر کے لئے شاہ صاحب کو پھر کسی نو آموز کو لانا پڑتا تھا مگر وہ کبھی ان دشواریوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے بلکہ ایک نوجوان کو بہترین صلاحیتوں سے آراستہ کرنے اور زندگی کی صحیح قدر و قیمت سمجھا دینے سے مرحوم کو جو روحانی سکون ملتا تھا ان کے لئے وہی سب سے بڑی طمانینت تھی۔

مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے میں نے دفتر رسالہ میں مرحوم ناصر انصاری صاحب رام پوری کو بحیثیت شاہ صاحب کے ماتحت دفتر رسالہ میں بیٹھے دیکھا، یہ ۵۰ء کی دہائی کے ابتدائی دور کی بات ہے، ناصر انصاری جبھی دار العلوم سے فارغ ہوئے تھے اور ایک لا اُبالی مگر ذہین و ذکی نوجوان تھے، دورانِ تعلیم شاہ صاحب مرحوم کے ساتھ ان کی نشست و برخاست تھی شاہ صاحب ان کے اندر جوہرِ قابل کو تلاش کر چکے تھے، دار العلوم سے فراغت کے بعد ان کو دفتر رسالہ میں

لے لیا گیا اور شاہ صاحب کی تربیت نے ان کو دن بدن نکھارنا شروع کیا۔ سب سے پہلے شاہ صاحب نے ان کو انگریزی امتحانات کی طرف متوجہ کیا اور اس کے ساتھ ہی عربی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا شوق پیدا کیا، چند سال کے عرصے میں ناصر انصاری مرحوم نے انگریزی زبان میں بی اے کر لیا اور عربی بول چال پر قابلِ قدر دسترس حاصل کر لی، اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب کا دیا ہوا یہ سبق ان کے ذہن میں انقلاب برپا کر چکا تھا کہ ع "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔

بہت جلد ناصر صاحب دفتر رسالہ سے نکل کر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں عربک یونٹ کے اسسٹنٹ سپروائزر کی حیثیت سے پہونچ چکے تھے، اس کے بعد وہ پریس ایشیا انٹرنیشنل سے شاہ صاحب کی ہمہ جہت تربیت کا خراج وصول کر رہے تھے۔

ان کے بعد شاہ صاحب نے ایک دوسرے نوجوان مشہود اقبال صاحب کو اپنے دفتر میں لیا مشہود صاحب کا یہ ابتدائی زمانہ تھا اور بقول خود ان کے انھیں قلم تک پکڑنا نہیں آتا تھا مگر شاہ صاحب کی دور رس نگاہیں ان میں ایک کامیاب تاجر اور کامیاب مضمون نگار کی پنہاں صلاحیتوں کو تاڑ چکی تھیں مشہود صاحب کو شاہ صاحب نے چند ہی سال کی تربیت کے ذریعہ جو خود آگاہی اور آگے بڑھنے کی تڑپ دی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جلد ہی انھوں نے اپنا ذاتی مکتبہ قائم کر کے جہاں اس کے ذریعہ دینی کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا وہیں "مشرب" کے نام سے اپنا ذاتی رسالہ جاری کر کے اس کی ادارت سنبھالی۔

پھر اسی طرح مولانا ڈاکٹر زبیر فاروقی دارالعلوم سے فراغت کے بعد شاہ صاحب کے دفتر میں ان کے فیض تربیت کے خوشہ چیں بنے، شاہ صاحب نے ان کی ہمتِ پرواز کو تاڑا اور انھیں اپنے قریب لے آئے۔ چند ہی سال کے بعد فاروقی صاحب رسالہ دارالعلوم کے مختصر ماحول سے نکل کر آل انڈیا ریڈیو کے عربک یونٹ میں اپنی صلاحیتوں کے لئے خراج تحسین وصول کیا اور آج وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر ہیں۔

ان کے بعد آنے والوں میں جناب زبیر جونپوری، جناب انوارالحق صاحب بیدل اور مرحوم سید فرحت ہاشمی وہ نوجوان ہیں جو دارالعلوم سے فراغت کے فوراً بعد بالترتیب شاہ صاحب مرحوم کی جوہر بیں نگاہوں میں آئے اور ہر ایک کو چند سال شاہ صاحب کی ماتحتی اور تربیت میں رہنے کا موقعہ ملا اور ہر ایک نے دفتر رسالہ دارالعلوم میں مختصر مختصر مدت گذار کر زندگی کا وہ ولولہ اور آگے

بڑھنے کی وہ امنگ حاصل کی کہ ان میں سے ہر ایک نے اس دفتر سے نکل کر آسمانوں پر کمندیں ڈالیں اور زندگی سے اپنی قیمت وصول کی، شاہ صاحب کے زیرِ تربیت رہتے ہوئے ان میں سے ہر ایک نے انگریزی کے امتحانات دیئے، عربیت پر قدرت حاصل کی اور قناعتِ حیات سے ہٹ کر اپنے لئے نئی نئی منزلیں تلاش کیں۔

انوار الحق صاحب بیدلؔ اور سید فرحت ہاشمی مرحوم کے پر پرواز نے انھیں ہندوستان کی سرحدوں کے پار سعودی عرب کی سرزمین مقدس میں پہونچایا، اور ان دونوں نے ریاض میں اپنے صلاحیت مندی کا اعتراف کرایا، یہ سب ان نوجوانوں کی تاریخ ہے جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے شاہ صاحب کی بے مثال تربیت اور مردم سازی کے روشن ثبوت ہیں اور ہمیشہ اپنی ترقی حیات کو شاہ صاحب کے فیضِ تربیت کی مرہونِ منت قرار دیتے رہے، یہ شاہ صاحب کا وہ خداداد ملکہ اور مردم شناسی اور مردم سازی کا جوہر تھا جس میں وہ منفرد شخصیت کے مالک تھے۔

میں نے شاہ صاحب کو ہمیشہ حلم و مروّت میں ایک ممتاز مقام پر پایا، شاہ صاحب کے بے تکلف احباب میں ہم لوگ بلحاظ عمر کافی چھوٹے تھے اور بالعموم اس فرق عمر کا لحاظ بھی رکھتے تھے مگر کبھی کبھی بے تکلف گفتگو میں ہم میں سے بعض لوگ حدود سے متجاوز ہو جاتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہنسی مذاق میں اپنے مقام اور ان کی عمر کی پاسداری نہ رہتی، کبھی ایسے چبھتے ہوئے جملے منھ سے نکل جاتے جو خوردی کے منافی ہوتے مگر یہ شاہ صاحب کی بڑائی اور عالی ظرفی، نیز انتہا سے زیادہ بردباری تھی کہ ان کی پیشانی پر کبھی شکن نہ آئی اور انھوں نے اپنے چھوٹوں کی شوخی و گستاخی اور بیجا جسارتوں کو انتہائی خندہ پیشانی سے انگیز کیا۔

شاہ صاحب ایک فرض شناس کارکن تھے جو اپنے متعلقہ کاموں کو مقررہ وقت میں مکمل کر دینے کے عادی تھے، اس معاملے میں ان کی عمر یا صحت کی کمزوری ان کی چستی و مستعدی کے لئے کبھی رکاوٹ نہیں بنی، اجلاس صد سالہ کی تیاریوں کے دوران تو شاہ صاحب کا ساتھ تقریبًا ہر وقت اور سفر اور حضر دونوں میں رہتا تھا، شاہ صاحب سفر کے معاملے میں انتہائی کم ہمت تھے، مظفر نگر اور سہارنپور تک کا سفر ان کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا مگر دار العلوم کے اجلاس صد سالہ کی ذمہ داریوں کے تحت وہ رات اور دن کے ہر حصہ میں آمادۂ سفر رہتے تھے۔

لکھنؤ، دہلی، میرٹھ، رڑکی وغیرہ کے سفروں میں وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ بعض اوقات ہم لوگ دو تین روز کے سفر کے بعد تھکے ماندے واپس آئے لیکن دیوبند پہونچنے کے ایک گھنٹہ بعد ہی دہلی سے فون آگیا کہ فوراً پہونچیے۔ میں اسی وقت شاہ صاحب کو ساتھ لینے کے لئے ان کے گھر پہونچا عشاء کے بعد کا وقت اور شاہ صاحب تھکن سے نڈھال مگر میرے کہتے ہی شیروانی اٹھا کر باہر نکل آئے۔ بعض اوقات دہلی یا لکھنؤ میں کاموں کے ہجوم اور حکام سے ملاقاتوں کے تسلسل میں ہم تھک کر چور ہو جاتے۔ کبھی کبھی تو پورا دن بغیر کھائے پیئے بسر ہو جاتا، کھانا تو درکنار چائے کی ایک پیالی تک میسر نہ آتی مگر شاہ صاحب پر جو مقصد کی لگن تھی وہ انھیں ہر چیز سے بے نیاز رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ جب کہ ہم اجلاس صد سالہ کے سلسلے میں دہلی میں تھے اور دن بھر مختلف وزارتوں کے دفاتر میں چکر لگاتے گذرتا تھا تو اسی دوران ایک روز سارا دن گذر گیا نہ ہمیں کھانے کا وقت ملا اور نہ چائے میسر آئی، شاہ صاحب کے علاوہ مولانا عبداللہ جاوید اور لکھنؤ کے چودہری علی مبارک صاحب ساتھ تھے، بھوک اور تھکن سے بھی جھنجھلائے ہوئے تھے آخر شام کو راہ میں ایک جگہ چنے بیچنے والا نظر آیا تو اس سے پچیس پچاس پیسے کے چنے خرید لئے، شاہ صاحب کی بھی تواضع کی باوجود دانت نہ ہونے کے انھوں نے بلا تامل تواضع قبول کر لی اور انتہائی بشاشت و شگفتگی کے ساتھ چنوں سے شغل کرتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے۔

یہ شاہ صاحب کی فرض شناسی ہی تھی کہ دفتر میں ان کی وقت کی پابندی بھی بے مثل تھی صحت کمزور تھی، اکثر و بیشتر بخار ہو جایا کرتا تھا مگر اسی حالت میں سب سے پہلے دفتر پہونچتے تھے نہ خود چھٹی لیتے تھے نہ دوسروں کو لینے دیتے تھے۔ ذاتی زندگی میں جتنے غیر مرتب تھے دفتری زندگی میں اتنے ہی منظم اور منضبط، ہمیشہ رسالہ دارالعلوم وقت کی پابندی سے خریداروں تک پہونچتا رہا، کیونکہ شاہ صاحب تازہ شمارہ کی تاریخ روانگی سے ایک ماہ قبل رسالہ تیار کر لیتے تھے اور یہ تیاری بھی اس شان سے ہوتی تھی کہ رسالے کے پیکٹ بنے ہوئے ان پر پتوں کے سلپ چپکے ہوئے اور ٹکٹ لگے ہوئے رہتے تھے۔

مضمون نگار تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں مگر شاہ صاحب کی زبردست خصوصیت

ان کی زود نویسی تھی، کئی بار ایسا ہوا کہ میری موجودگی میں کسی نے آکر مضمون لکھ دینے کی فرمائش کی اور شاہ صاحب ان کو وعدہ دینے کے بجائے مضمون ہی دینے پر آمادہ ہو گئے، فوراً ہی کاغذ اٹھا کر قلم برداشتہ مکمل مضمون پندرہ بیس منٹ میں تیار کیا اور فرمائش کرنے والے کے حوالے کر دیا، زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ قلم کی نوک کاغذ پر رکھ دینے کے بعد گویا مضمون پورا کئے بغیر اٹھاتے ہی نہ تھے، مضمون کی مرتب شکل میں آمد انکی مسلسل ہوتی تھی کہ درمیان میں قلم اٹھانے اور سوچنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی۔

اسی طرح شاہ صاحب کی گفتگو جہاں بیحد دلچسپ اور قہقہہ بار ہوتی تھی وہیں سنجیدگی کے موقعہ پر نہایت مرتب اور پر مغز ہوا کرتی تھی، وہ بڑی جلدی بات کی تہہ تک پہونچ کر اصل مقصود پر تبصرہ اور رائے زنی کر دیا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ بات اس قدر مخلصانہ اور مشفقانہ انداز میں کہتے تھے کہ مخاطب ان کے لب و لہجہ کی مٹھاس میں گم ہو کر یہ بھول جاتا تھا کہ شاہ صاحب کے ہاتھوں اس کی رائے کا کیا حشر ہو چکا ہے اور اس کے نقطۂ نظر کی کیا دُرگت بنی ہے۔

شاہ صاحب کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا اور ہر مجمع میں وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے تھے، ہر ماحول کے مطابق اسی سطح کی گفتگو کرنا اور اسی قماش کے قہقہے لگوا دینے میں شاہ صاحب یدِ طولیٰ رکھتے تھے، وہ دوستوں کے دوست، چھوٹوں کے مشفق سرپرست اور پریشان خیال نوجوانوں کے مربی و مشیر تھے، خود میرا معمول ہمیشہ یہی تھا کہ اگر کسی الجھن اور پریشانی میں مبتلا ہوں تو قدم خود بخود شاہ صاحب کی محفل کی طرف اٹھتے تھے، مرحوم کے پاس ایک گھنٹہ بیٹھنے کے بعد ہی یہ بھول جایا کرتا تھا کہ کچھ دیر پہلے میں پراگندہ ذہنی کا شکار تھا، معاملات میں شاہ صاحب فوری رائے دینے کے عادی تھے مگر اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے تھے، البتہ اپنی حد تک وہ اپنے نقطۂ نظر پر پختہ رہتے تھے، زندگی کے حوادث اور گرد و پیش کے حالات کا وہ بغور مطالعہ کرتے اور ان سے زندگانی کے اصول مستنبط کرنا مرحوم کی خاص ادا تھی۔

۱۹۶۰ء کی دہائی سے تقریباً ۱۹۷۵ء تک ہمارا معمول تھا کہ روزانہ راقم الحروف، مولانا عبداللہ جاوید، مولانا عبداللہ سلیم اور مختار علی صاحب (امدادیہ بکڈپو) بعد نماز عصر شاہ صاحب کے مکان پر جاتے اور وہاں سے ان کو ساتھ لے کر چہل قدمی کے لئے جنگل جایا کرتے تھے جہاں ایک مخصوص کھیت میں

ہرٹ پر جاکر بیٹھ جایا کرتے تھے، برسہا برس تک یہ معمول رہا، اس چہل قدمی کے دوران شاہ صاحب سے ہر ہر موضوع پر باتیں ہوا کرتیں جس میں سیاسیات، معاشیات، شخصیات اور مذہبیات سے لے کر معاشرتی انقلابات تک کوئی موضوع ہماری زد سے محفوظ نہیں رہتا تھا۔ ان بحثوں میں شاہ صاحب کے مطالعے ناقدانہ نظر اور قوت استنباط کا اندازہ ہوتا تھا، وہ ہر مسئلے کا اچھی خاصی گہرائی کے ساتھ تجزیہ کر کے اس کے نتائج کو ذہن میں مجتمع کر کے اور پھر اس سے اپنا ایک اصولی نقطۂ نظر بنا لیتے تھے، ہر مسئلے کی تفصیلات کا ان کے ذہن میں کافی مواد رہتا تھا اور اپنی غیر معمولی قوت حافظہ کے بل پر وہ اس معاملے میں اپنی معلومات کے لئے مقابل سے خوب خوب داد تحسین وصول کرتے تھے۔

مگر شاہ صاحب کے وہ سب اصول و نظریات صرف تقریر و بیان کے لئے ہوتے تھے خود اپنی زندگی کو انھوں نے اصول و قواعد کے گورکھ دھندوں سے ہمیشہ آزاد رکھا، نہ کھانے پینے میں اصول نہ پہننے اوڑھنے میں نفاست کا اہتمام، نہ سونے جاگنے میں انضباط اور نہ لکھنے پڑھنے کے لئے اوقات کا تعین، لباس کے معاملے میں اپنے سراپا سے بے نیاز رہتے، پھٹا ہوا یا بے جوڑ، پیوند لگا ہوا، جیسا کپڑا ہاتھ لگا پہن لیا، دیکھنے والوں کے تبصروں سے ہمیشہ بے پروا رہتے، ایک دفعہ شاہ صاحب نے سردی کے موسم میں ایک بہت موٹے، کھردرے اور بے ڈھب سے اونی کپڑے کی شیروانی بنوائی جس کا رنگ خوب سبز تھا اور بُنائی ٹاٹ جیسی، میں عبداللہ جاوید صاحب اور قاری عبداللہ سلیم صاحب وغیرہ دفتر رسالہ میں پہونچے تو اس شیروانی کو دیکھ کر بے ساختہ قہقہے لگائے اور شیروانی کا خوب مذاق بنایا کہ شاہ صاحب نے مطبخ کی خالی بوری خرید کر سبز رنگ میں رنگوائی ہے اور اس میں آستین لگوا کر پہن لی ہے، ہم لوگ چڑھا رہے تھے اور شاہ صاحب دل کھول کر چڑھ رہے تھے، کبھی جھنجلاتے اور کبھی قہقہہ لگاتے، یہ تو شاہ صاحب کے ملنے والے سبھی جانتے ہیں کہ شاہ صاحب کے قہقہے بجائے خود قہقہہ آور ہوا کرتے تھے، کھانے پینے میں بھی شاہ صاحب کا کوئی نفیس مذاق نہ تھا نہ وقت کی قید تھی، کبھی رات کا کھانا عصر کے وقت کھا لیتے، کبھی دوپہر کا کھانا صبح ناشتے کے ساتھ ہی ادا ہو جایا کرتا تھا، جو کچھ اور جس وقت سامنے ہوتا نہایت رغبت سے کھایا کرتے تھے، ہمیشہ کی عادت تھی کہ رات کو دو تین بجے سوتے، سوتے سے اٹھ کر باورچی خانے میں پہونچتے اور نعمت خانے سے کچھ نکال کر کھاتے دفتر میں اپنی عادتیں سنا کر ان پر تبصرے کراتے اور قہقہے لگاتے تھے۔

لاپرواہی اور لاابالی پن وہ اپنے طرز واداسے ظاہر کرتے مگر حقیقۃً وہ اپنے سینے میں ایک حساس اور دردمند دل رکھتے تھے، اپنے حلقہ احباب میں سے کسی کی تکلیف و پریشانی سے بے چین ہو اٹھتے تھے اور ممکن حد تک اس کی چارہ گری کیا کرتے تھے، بڑے سے بڑے حادثہ پر ان کی سطح پرسکون نظر آتی اور ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھیلتی رہتی، لیکن جب کبھی اطمینان سے بات کرنے کا موقعہ ملتا تو ان کے دل کا درد لفظوں میں ڈھل کر ان کے ہونٹوں پر آجاتا اور وہ ایک بالکل بدلی ہوئی شخصیت کے روپ میں نظر آتے۔

والدِ محترم حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ شاہ صاحب کے سابق ہمزلف ہی نہیں ان کے مربی، ان کے بزرگ اور سرپرست بھی تھے مگر حضرت کی حیات تک کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہوا کہ حضرت سے شاہ صاحب کو اس قدر والہانہ محبت وعقیدت ہے، شاہ صاحب نے ہمیشہ اپنے حقیقی جذبات پر حسب عادت لاابالی پن کے پردے ڈالے رکھے، مگر حضرت کی وفات کے ساتھ ہی وہ سب حجابات اُٹھتے چلے گئے اور حضرت کی جدائی کا صدمہ شاہ صاحب جیسے قلندر صفت انسان کی قلندری کو اپنے دھارے میں بہالے گیا، ہم نے مدت العمر شاہ صاحب کو روتے نہیں دیکھا تھا، ہمارے نزدیک ان کی آنکھیں صرف مسکرانے اور ہنسنے کے لئے تھیں، ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا تصور بھی مضحکہ خیز تھا، لیکن ان ہی آنکھوں کو ہم نے حضرتؒ کے بعد زار زار روتے دیکھا۔ حضرت کے بعد شاہ صاحب نے سوا دو سال سے اوپر زندگی کی مہلت پائی مگر اس عرصے میں ان کا موضوع گفتگو اکثر حضرت کی شخصیت ہوتی بات بات پر ان کی آنکھیں بھر آتیں اور کئی بار وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتے، ہمارے لئے شاہ صاحب کا یہ بالکل انوکھا اور نرالا روپ تھا۔

شاہ صاحب ایک ایسی مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے کہ ہر محفل اور ہر انجمن میں اپنی مخصوص شوخ مزاجی کی بدولت ممتاز رہتے تھے، فقرے کسنا اور فقرے سننا ان کی ایک ایسی ادا تھی کہ ایک نووارد تک ان کی محفل کا بے تکلف ہم نشین نظر آنے لگتا تھا، مگر ان فقرے بازیوں میں بھی مقابل کی مزاج داری و دلداری کا پہلو پیش نظر رکھتے تھے، کسی کو شرمندہ یا بے حجاب کرنا کبھی ان کا مقصد نہیں ہوا، خیالِ خاطرِ احباب اس قدر تھا کہ کسی کی ادنیٰ گرانی سے پریشان ہو جاتے تھے، اور جلد ہی اپنے پُر محبت برتاؤ سے اس کے دل کا میل دور کر دیتے تھے، دارالعلوم سے

وابستگی کے اخیر دور میں شاہ صاحب کی محفلوں کا جو مجمع تھا اس میں راقم الحروف کے علاوہ مولانا عبدالحق صاحب مرحوم پیشکارِ دارالعلوم، مولانا محمد عثمان صاحب مرحوم چیرمین، مولانا محمود احمد صاحب گل مرحوم ناظمِ تنظیم، مولانا محمد سالم صاحب قاسمی، مولانا عبداللہ جاوید صاحب، مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب، مولانا بدرالحسن صاحب ایڈیٹر الداعی، مولانا ظفیرالدین صاحب، مختار علی صاحب (مکتبہ امدادیہ) حکیم عزیزالرحمن صاحب، اور کبھی کبھی مولانا محمد حسین صاحب بہاری ہوا کرتے تھے، اب اس مجمع میں سے کچھ حضرات تو دنیا ہی سے اٹھ گئے، کچھ ہندوستان سے باہر جا کر آباد ہو گئے اور باقی دیوبند ہی میں رہتے ہوئے بکھر گئے، کیونکہ وہ میرِ مجلس ہی چلا گیا جس کے دم سے کبھی وہ مجلسیں آباد تھیں وہ قہقہہ بار شخصیت اور اس کی وہ زعفران زار محفلیں اب صرف ایک داستانِ پارینہ اور ایک بیتے دنوں کی یاد ہے اور اس یاد کو مجتمع کرنے بیٹھتے ہیں تو وہ ایک خلش بن کر دلِ دجگر کو برما جاتی ہے

آہ وہ نام جو ایک پل نہ بھلایا جائے

مولانا شاہین جمالی صاحب

مدیر پندرہ روزہ دیوبند ٹائمز دیوبند

کاغذ کے صفحے پر ایک ٹیڑھی میڑھی سی لکیر کھینچئے تو اس سے ایک ایسا جانا پہچانا سا نام ابھرے گا جو ابھی، ۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کے پہلے تک اپنی فانی ذات کے دائرہ میں محدود تھا، لیکن اپنی باقی شخصیت کی وسعت میں آج بھی زندہ وجاوید ہے۔ وہ ہر قلم کی نوک سے اس قدر مانوس اور وابستہ تھا کہ غیر شعوری طور پر کوئی شخص کاغذ پر کچھ لکھنا چاہے تو اسی کا دستخط نمایاں ہو جاتا ہے۔ یعنی

مولانا سید ازہر شاہ قیصر اپنے نام سے اتنے بڑے بادشاہ لگتے تھے جس کی قلمرو میں فارس اور روم ہی نہیں عرب بھی شامل ہو (ازہر عربی لفظ ہے، شاہ فارسی اور قیصر شاہانِ روم کا لقب ہے)۔ لیکن اپنی شخصیت کے اعتبار سے وہ سراسر فقیر اور بے نفس انسان واقع ہوئے تھے۔

حضرت شاہ صاحب سے بیس برسوں تک میرا ادبی صحافتی رشتہ قائم رہا، انھیں بہت قریب سے میں نے دیکھا، بہت کچھ سیکھا، بہت سی جزئیات نگاہ میں آئیں بہت سے واقعات وحادثات دیکھے، کتنی صبح وشام کے سرد وگرم حالات کا مشاہدہ کیا، بہت سے نشیب وفراز سامنے آئے مگر آفریں ہے اس مرد درویش پر جس کی زندگی کا ہر لمحہ پہاڑ کی طرح مضبوط اور برسات کی ٹھنڈی چاندنی کی طرح بے داغ رہا، رائے میں صلابت، عقیدے میں پختگی، کردار میں عظمت، گفتار میں متانت، افکار میں رفعت کام میں ہمت اور احباب ومتعلقین کے لئے اخلاص ومودت، ان کی شخصیت میں پیوست بلکہ اس طرح رچ بس

گئی تھی کہ لب پر ان کا نام آتے ہی یہ سارے اوصاف کمال ذہن کے پردے پر متحرک ہو جاتے ہیں۔
قضیۂ دار العلوم میں بھی شاہ صاحب اپنی رائے اور عقیدے پر آخر وقت تک قائم رہے اور درمیان میں مولانا محمد عثمان صاحبؒ کی خواہش پر دار العلوم سوسائٹی میں ان کی چند گھنٹوں کی واپسی ان کی قلابازی نہیں بلکہ "تقیہ" تھا، تاہم ان لمحات میں شاہ صاحب پر جو کچھ گذرا وہ گہرے زخم کی طرح اندر ہی اندر شاہ صاحب کو چاٹتا رہا اور بالآخر اسی حادثے نے ان کی متاعِ حیات بھی ان سے چھین لی، لیکن واقعات گواہ ہیں کہ ان کی متاعِ لوح و قلم کو وقت کی کوئی طاقت حیاتِ مستعار کے آخری سانس تک ان سے نہیں چھین سکی۔

بیماری کے طویل ایام حضرت شاہ صاحب کے جسم کو تو متاثر کر سکے، لیکن ان کے ذہن و فکر نے بیماری کے عذر کو اپنی کائنات میں داخل نہیں ہونے دیا، انھوں نے پورے حوصلہ اور مکمل صبر و استقلال کے ساتھ اپنی علالت کا مقابلہ کیا، اور اس وقت جب کہ ان کا جسم غیر متحرک حالت میں بستر سے چمٹ گیا تھا قلم حسب معمول کاغذ پر چلتا رہا اور ان کا فکر اپنی زندگی کی رگ رگ کا ایک ایک قطرۂ خون نچوڑ کر ادب و صحافت کی تاریخ کو سرخ عنوان عطا کرتا رہا، چنانچہ "دیو بند ٹائمز" کے "عثمان نمبر" میں شریک حضرت شاہ صاحب کا آخری مضمون اس کی شہادت دیتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ دیو بند کے ادب و صحافت کی آبرو اور اس کی عظمت و ناموس کے محافظ اور ادب و صحافت کی پچھلی پاکیزہ شخصیات کی باقیات صالحات میں سے تھے، جن کے وجودِ مسعود سے ادب و صحافت کی مشرقی تہذیب و روایت کا تسلسل برقرار تھا، مگر افسوس کہ ؎

داغِ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حضرت شاہ صاحب کو اپنے بزرگوں سے اس قدر عقیدت تھی کہ حالات کے انقلاب اور سیاست کے زیر و زبر میں بھی وہ اس پر قائم رہتے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے صرف سیاسی نہیں خود حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ کے تعلق سے ذاتی اختلاف کے باوجود اس قدر عقیدت تھی کہ ان کے ساتھ کسی طرح کی بے احترامی کو گوارہ نہیں کرتے تھے اور ایسے موقع پر جب کوئی شخص حضرت سے اختلاف ظاہر کرتا، پنجاب کے ایک نوجوان کا واقعہ سنایا

کرتے تھے جس کو حضرت کی بے احترامی نے بالآخر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا، حضرت شاہ صاحب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے فدائیت کا تعلق رکھتے تھے، اور انھیں اپنے والد بزرگوار کی جگہ "بھائی جی" کہا کرتے تھے، حضرت حکیم الاسلام کی وفات کے بعد شاہ صاحب ہی نے سب سے پہلے "اشاعتِ حق" کا "طیب نمبر" شائع کیا تھا اور اس کے "حرفِ آغاز" میں حکیم الاسلام کی شخصیت کے قتل میں جن ہاتھوں کی نشاندہی کی تھی اس نے قارئین کو چونکا دیا تھا، اپنی زندگی کے آخری دور میں حضرت شاہ صاحب ادب وصحافت کی خدمت کے علاوہ حضرت حکیم الاسلام کے تعلق کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے ماہنامہ "طیب" جاری کیا جو آج بھی جاری ہے، اور یہ محض لطیفۂ غیبی ہے کہ اب "طیب" ہی کے صفحات میں حضرت شاہ صاحب کو حیاتِ طیبہ اور فدائے طیب کو آغوشِ طیب نصیب ہو رہی ہے، شاید جگر نے اسی موقع کے لئے کہا تھا ؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر :: عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر اتنی شستہ اور برجستہ ہوتی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ پڑھتے ہی چلے جاؤ، وہ جب اپنے قلم سے کسی کو چھیڑتے گدگداتے یا کسی پر طنز وتعریض کرتے تو وہ رگِ احساس میں نشتر بن کر اتر جاتا تھا مگر قلم کی نوک پر ان کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی کہ وہ حدِ ادب سے آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے اور قاری کسی بھی سطر پر "سوقیت یا پھوہڑپن" کا الزام لگانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ دیوبند کی بعض شخصیات اور ان کے افکار واعمال پر تنقید کرتے تو "لبِ سڑک کی فلک بوس عمارت سے سنگباری" کا ذکر کر کے اس طرح بامعنیٰ خاموشی اختیار کر لیتے کہ یہی خاموشی خود بولنے لگتی تھی۔ ایک مرتبہ غازی صاحب کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ "بمبئی ان کا مکان اور دیوبند ان کے مکان کا صحن ہے" اور اسی مختصر سے جملے میں انھوں نے غازی صاحب کی حیات وکائنات کو سمیٹ لیا تھا۔

اپنی وفات سے پانچ سال پہلے اپنے فرزند ارجمند "نسیم اختر شاہ قیصر" کے مرتب کردہ اپنے مجموعۂ مضامین پر ایک مختصر سا مقدمہ لکھا جس کا نصف حصہ صرف یہ تھا:

"اچھا تھا کہ ان مضامین کی ایک ترتیب ہوتی کہ دینی مضامین ایک طرف، تاریخی

ایک طرف، لیکن ان کی بے ترتیبی میری زندگی کی بے ترتیبی کی مثال ہے۔ ۶۰ر سال کی عمر تو بے ترتیبی اور رواردی میں گذری اب آخری وقت میں کیا ترتیب کیا تبویب ؎ عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

مگر ان ہی دو ڈھائی سطروں میں انھوں نے واقعی اپنی زندگی کی مکمل تاریخ مرتب کردی تھی اور اپنے متضاد اوصاف کمال کا بھرپور تجزیہ کردیا تھا۔۔میں بجا طور پر محسوس کرتا ہوں کہ شاہ صاحب کی شخصیت کے اتنے ابواب اور ذیلی عنوانات ہیں جن کی ترتیب و تبویب کسی مختصر سے مضمون میں ممکن ہی نہیں۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کے تصور کے ساتھ کم وبیش ۴۵ برسوں کی ایک پوری داستان نظروں کے سامنے متحرک ہونے لگتی ہے، اور اس تیزی کے ساتھ اس کے مناظر ذہن سے گذرتے ہیں کہ کسی ایک منظر پر نگاہ جمنے نہیں پاتی کہ دوسرا شروع ہوجاتا ہے، مجھے یاد نہیں کہ ان سے پہلی بار کب ملنا ہوا تھا لیکن جب پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جزو لاینفک کی طرح میری زندگی سے وابستہ تھے، جس طرح آدمی کو یہ یاد نہیں رہتا کہ اس نے اپنے ماں باپ کا چہرہ کب پہلی بار دیکھا تھا، لیکن وہ اس حقیقت کو جانتا ہے کہ یہ لوگ اس کی زندگی سے پوری طرح وابستہ ہیں، کم وبیش یہی صورت مولانا ازہر شاہ قیصر اور میرے تعلقات کی تھی۔

وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے، محدث العصر علامہ انور شاہؒ کی صورت مجھے دھندلی سی یاد ہے ہزار کوشش کرتا ہوں تو بھی ان کا ہیولیٰ ہی باقی رہتا ہے، خدوخال واضح نہیں ہو پاتے، اتنی بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی رحلت اور میری والدہ کی وفات میں بس دنوں کا فرق ہے۔ یہ بھی یاد نہیں آیا کہ ان کے گھر والے اماں جی اور شاہدہ بی پہلے ہمارے گھر تعزیت کے لئے آئے تھے یا میری دادی اماں علامہؒ کی تعزیت کو شاہ منزل پہلے گئی تھیں — اور شاہ جی (ازہر شاہ) اس وقت ڈابھیل سے تعلیم وتربیت حاصل کرکے دیوبند واپس آچکے تھے، میں نے ہوش سنبھال کر انھیں اپنے سے ویسا ہی بے تکلف شفیق اور مہربان دیکھا جیسے کہ وہ آخر تک رہے۔

انھوں نے دارالعلوم کے اس پہلے زلزلے کے مناظر کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا جس میں ان کے یگانۂ روزگار اور بے مثال محدث اور عالم علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ

براہیم بلیاوی رہ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی ؒ جیسے اکابرین، اور مفتی محمد شفیع، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ؒ جیسے درجنوں ایسے لوگ دارالعلوم سے بے دخل ہو گئے جو آگے چل کر اکابرینِ
ملت میں شمار ہوئے، اور جن کے دارالعلوم سے الگ ہو جانے کے سبب اس کی علمی روح اس طرح
نکلی کہ پھر آخر تک واپس نہ آسکی ۔ اور اس آخری انہدام جیسی کیفیت کا بھی نظارہ کیا جس کے بعد
دارالعلوم دیوبند کا دینی اعتبار، مذہبی تقدس اور زیادہ صحیح یہ کہ اس کا وجود ہی ختم ہو کر رہ گیا، اس آخری
جھٹکے کی زد میں وہ خود بھی آئے اور مولانا قاری محمد طیب ؒ کی طرح وہ بھی اس صدمہ کے قتیل بنے جس کے
بانی و مبانی وہ لوگ تھے جن کی علمی دینی ثقاہت اور اعتبار شہرت و ناموری میں ان کے فقید المثال والد
علامہ انور شاہ کشمیری رہ کی نسبت اور تعلیم و ارشاد کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔

اب سے ۴۰ ر ۴۲ برس پہلے کا دیوبند آج جیسا ویران اور آثار قدیمہ جیسی کیفیتوں کا حامل
نہیں تھا، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ادریس کاندھلوی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، علامہ ابراہیم
بلیاوی، مولانا عزیر گل، اور مولانا نافع گل، مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی، مولانا محمد طاہر قاسمی
علامہ شبیر احمد عثمانی جیسی مغتنم روزگار شخصیتیں دیوبند ہی میں موجود تھیں، اور ان کی وجہ سے اقصائے
عالم سے مشاہیر کھنچے ہوئے دیوبند چلے آئے تھے، اور دنیا بھر کے مشہور سیاست دانوں عالموں
اور سر آمد روزگار شخصیتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی
عطاء اللہ شاہ بخاری، خان عبد الغفار خاں، آصف علی، مولانا ابوالکلام آزاد، لال بہادر شاستری
پنڈت گووند بلبھ پنت، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ظاہر شاہ والیٔ افغانستان، حافظ محمد ابراہیم،
اور ایسے ہی نہ جانے کتنی شخصیتوں کو دیوبند والوں نے گھر بیٹھے ان ہی اکابرین کی وجہ سے دیکھا
اور ان کی باتیں سننے، ان کے افکار سے واقف ہونے کا موقع حاصل کیا۔

ان نابغۂ روزگار ہستیوں کے ہجوم اور دنیا کے منتخب لوگوں کے افکار کا سایہ ان لوگوں
کے ذہن و قلوب پر پڑنا ہی تھا، جو علمی مذاق اور ادبی رجحانات رکھتے تھے، اس لئے اس زمانہ میں
تحریر و تقریر سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک پوری نسل تیار ہو گئی، اور دیوبند کی نسبت
سے ازہر شاہ قیصر، سید محبوب رضوی، عامر عثمانی، زبیر افضل عثمانی، مخمور عثمانی، امتیاز نسیمی،
انور صابری، اور اقبال نسیم اس زمانے کے ادبی، سیاسی اور علمی حلقوں کے معروف نام تھے

امتیاز علی تاج، حامد الانصاری غازی، ابوسعید بزمی، دیوبند چھوڑ چکے تھے لیکن ہم ان کا شمار اپنے ہی میں کرتے تھے۔

اردو زبان پر بھی سیاہ بختی کا سایہ اس وقت تک نہ پڑا تھا اس لئے ہر دن ادبی محفلیں ہوتیں، ہر رات صحبتیں جمتیں اور ہر وقت تحریر، تقریر، شاعری اور ترجمہ کے موضوعات گفتگو میں آتے رہتے، مولانا عبدالوحید صدیقی بھی جنھوں نے بعد میں "نئی دنیا" "وہما اور ہدیٰ" جریدے نکال کر بڑا نام پیدا کیا، اس وقت دیوبند میں مقیم تھے اس لئے پوری فضا علمی اور ادبی ہو گئی تھی میری تحریری زندگی کا آغاز بھی اسی ماحول میں ہوا اور ابتدا میں ادب اور ادبی تنقید تک ہی یہ میدان محدود رہا۔

سب سے بڑا فائدہ اس ماحول کا یہ تھا کہ سوسائٹی میں شامل سب لوگ اپنا ایک منفرد اسلوب تحریر رکھتے تھے، عامر عثمانی، زبیر افضل عثمانی اور انور صابری شاعر تھے، سید محبوب رضوی ازہر شاہ قیصر، مخمور عثمانی، امتیاز نسیمی، اور اقبال نسیم کی انشاپردازی اور ادب و تاریخ اور ترجمہ سے دلچسپی تھی، یہ لوگ شاعری بھی کبھی کبھار اسی طرح کر لیتے جس طرح شاعر حضرات کبھی کبھار نثر لکھ لیتے، لیکن ان موضوعات سے ان کا تعلق بس دعا سلام کی حد تک ہی رہتا۔

شاہ جی کی افتاد طبع صحافت کی طرف مائل تھی، مزاج علمی تھا، سید محبوب رضوی تاریخ اور تحقیق سے دلچسپی رکھتے تھے، مخمور عثمانی، امتیاز نسیمی کو ترجموں سے مناسبت تھی، اقبال نسیم افسانہ نگاری کا شوق رکھتے تھے، انور صابری، عامر عثمانی اور زبیر افضل عثمانی کا میدان شاعری تھا کوئی بڑا ادبی، سیاسی جلسہ اور کوئی بڑا مشاعرہ ایسا نہ ہوتا جس میں ان لوگوں کی آواز نہ گونجتی ہو۔

شاہ جی ۱۹۴۷ء سے کچھ دنوں پہلے لاہور گئے، جہاں زمیندار، شہباز، احسان، زمزم اور آزاد جیسے مشہور اخباروں میں ان کے مضامین علمی اور وقتی موضوعات پر چھپے اور پورے ملک میں مقبول ہوئے، ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ دیوبند آ کر مستقل طور پر مقیم ہوئے تو انھوں نے اپنی پہلی باقاعدہ کتاب "حیاتِ انور" مرتب کر کے شائع کی، ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے اس زمانے کا نیشلسٹ اخبار ہفتہ وار استقلال کے بھی وہ مستقل کالم نگار تھے، ۴۸/۱۹۴۷ء میں دیوبند سے دو ماہوار رسالے دینی، سیاسی اور تاریخی موضوعات پر نکلے، ایک تجلی تھا اور دوسرا ہادی، تجلی کی ادارت عامر عثمانی

اور زبیر افضل عثمانی نے سنبھالی، اور رسالہ کی ضرورت سے شاعری کے علاوہ نثر کا میدان بھی سنبھالا اور بہت جلد مسجد سے میخانے تک کے مستقل کالم میں ایک منفرد اسٹائل بھی پیدا کرلیا، ہادی کئی برس تک سید محبوب رضوی، ازہر شاہ قیصر اور میرے نام کے ادارۂ تحریر کے ساتھ نکلتا رہا، پھر شاہ جی کا رسالہ دارالعلوم کا دور شروع ہوا جو شاید ۳۵ برس سے بھی زائد مدت تک جاری رہا۔

اتنی مصروفیات اور اتنی شہرت اور بے شمار مضامین کے مصنف ہونے کے باوجود شاہ جی اس متنوع قابلیت اس بے نظیر صلاحیت اور علمی تبحر کے شایانِ شان کام نہیں کرسکے جو ان کے اندر موجود تھیں اور قدرت کے خاص عطیہ کا درجہ رکھتی تھیں، ان کی عالمانہ شان، علمی سرمایہ پر ان کی نظر اور ادق مسائل پر ان کی جچی تلی رائے کا جیسا اظہار ان کی گفتگو میں ہوتا تھا اسے کسی مستقل تصنیف میں منتقل کردینے کی مہلت وہ نہیں پاسکے۔

اپنے سے بڑوں کے ساتھ اپنے وقار کا جتنا اہتمام اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور بے تکلفی کا جیسا برتاؤ وہ رکھتے تھے اس کی دوسری مثال ان کے معاصرین میں نہیں پائی جاتی تھی میں نے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جیسے لوگوں کو ان کی ناز برداری کرتے دیکھا، اور خود شاہ جی کو مولانا محمد سالم قاسمی مولانا محمد اسلم قاسمی اور میرے اپنے چھوٹے بھائی محزون مرحوم کی ناز برداری کرتے پایا۔

وہ اختلاف ہر کسی سے کرسکتے تھے، مخالف کسی کے نہیں تھے، ناراض ہونے اور ناراض کرنے میں انھیں دیر نہیں لگتی تھی، لیکن ناراض رہنے اور ناراض رکھنے کے وہ قائل نہیں تھے، خود بہت جلد من جاتے اور دوسروں کو بھی بہت جلد منا لیتے تھے۔

وہ علمی درجہ اور دینی علویت میں اپنے قابلِ فخر والد علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ہمسری نہیں کرسکے لیکن مظلومیت اور محرومیت میں ان کی جانشینی کا انھوں نے حق ادا کردیا۔

شاہ جی کے اس جہانِ فانی سے گذر جانے کے بعد وہ پرانی علمی، ادبی اور شعری بساط مکمل طور پر اجڑ گئی جو پرانی اور نئی نسل کے درمیان پل کا کام دے رہی تھی ——— ایک میں اس کی سوگواری اور مجاوری کے لئے باقی رہ گیا ہوں تو میری حیثیت بھی داغِ فراقِ شب کی جلی ہوئی اس شمع جیسی ہے جو نہ معلوم کس وقت بھڑک کر خاموش ہوجائے ——— " سدا رہے نام اللہ کا:

جانے والے کی یاد آتی ہے

مولانا قمر عثمانی صاحب

محترم جناب سیدازہرشاہ صاحب قیصر کا حادثۂ وفات غیر متوقع اور اچانک نہیں ہوا، بلکہ مرحوم کے ایک عرصہ سے علیل ہونے کی وجہ سے ہر وقت اس حادثے کا دھڑکا لگا رہتا تھا مختلف عوارض کا نشانہ بنے رہنے کی وجہ سے نحیف وناتواں تو بہت پہلے سے چل رہے تھے تاہم شاید سقوط دارالعلوم دیوبند کے حادثے نے مرحوم کی صحت کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا، وہ اس موضوع پر زبان سے جو کچھ کہتے تھے اس سے ان کے دل کے کرب کا اندازہ ہوتا ہے، اور اسی میں وہ بتدریج گھلتے چلے گئے، جب بھی بازار میں یا کہیں اور ملاقات ہوتی وہ بات کرتے اپنی مسلسل بیماری اور ضعف کا تذکرہ کرتے، لیکن ان کی باتوں کے پس پردہ جسم و روح کو کھائے جانے والا غم صاف جھلکتا نظر آتا تھا، بالآخر ایک روز بیماریوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے موت نے ان کو شکست دیدی، موت ایک اٹل حقیقت ہے اس سے کسی کو مفر نہیں تاہم مرنے والے کے کام اور اس کی خوبیاں بعد میں ضرور یاد آتی ہیں، مرحوم کی وفات کی خبر میں نے سنی تو دل کو ایک دھکا لگا، میں نے محسوس کیا کہ ایک مخلص بے لاگ، تجربہ کار، ہمدرد بزرگ سے ہم محروم ہو گئے۔ ان سطور کے لکھے جانے تک نہ جانے کتنی باتیں کتنی یادیں مجھ کو یاد آرہی ہیں جن کے سہارے میں مرحوم کا مختصر سا ذکر خیر یہاں کر رہا ہوں۔

تقریباً بیس پچیس برس پہلے کی بات ہے، جب مجھے مرحوم سے پہلی بار تعارف کا موقعہ میسّر آیا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں بعد مغرب علمی نشست ہوتی تھی، میں اکثر اس میں حاضر ہوتا اور حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے ارشادات سے مستفید ہوتا تھا ایک روز گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت سفر میں گئے ہیں، اس لئے مجلس نہیں ہوئی نشست گاہ میں دو

تین حضرات آپس میں گفتگو کر رہے تھے، میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا، جب گفتگو ختم ہو گئی تو ایک صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے، بہت سی باتیں کیں، بہت سی باتیں مجھ سے پوچھیں اور کہنے لگے کہ میں تمھیں جانتا ہوں بھلے ہی تم مجھے نہ پہچانتے ہو، مرحوم کی باتوں میں ہمدردی کی جو ایک لہک تھی میں اس سے اچھا خاصا متاثر ہوا، بطورِ خاص مرحوم نے باصرار جو تقاضا کیا وہ یہ تھا کہ تم ماہنامہ دارالعلوم کے لئے مضامین لکھا کرو، یہ دارالعلوم کا تم پر حق بھی ہے اور تمھارے لئے بہت مفید بھی، چنانچہ میں نے مرحوم کے حکم کی تعمیل میں مضامین لکھے، ماہنامہ دارالعلوم پابندی سے میرے نام آنے لگا، کبھی کبھی تبصرہ کے لئے میرے پاس کوئی کتاب بھجوا دیتے، میں تبصرہ لکھ کر بھجوا دیتا، مضمون وغیرہ کی اشاعت کے بعد ملاقات ہوتی تو میری حوصلہ افزائی فرماتے، بہت اچھے اچھے مشورے دیتے جس سے میں فائدہ اٹھاتا، ایک مرتبہ دارالعلوم میں بہت خطرناک قسم کا ہنگامہ اور اسٹرائک ہوئی ملک کے اخبارات و رسائل نے اس پر بہت کچھ لکھا، میں نے ایک تنقیدی انداز کا مضمون لکھا اور شاہ جی کو بھجوا دیا، خیال یہ تھا کہ تنقیدی ہونے کی وجہ سے اس کو شائع نہیں کریں گے، مجھے یاد ہے کہ مضمون میں میں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ دارالعلوم کے اس ہنگامے میں ساری خطا طلبہ کی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بڑوں کے طرزِ عمل کو بھی دخل ہے اس لئے کہ چھوٹے اپنے بڑوں سے ہی متاثر ہوتے ہیں اس لئے ان کی اصلاح سے پہلے اپنا احتساب بھی ضروری ہے. مضمون کی اس نوعیت کے پیشِ نظر یہ خیال کم ہی تھا کہ شائع ہو جائے گا مگر ان کے حوصلے اور ظرف کی بات تھی کہ مضمون شائع کیا اور اس پر ایک بہت محتاط اور معتدل نوٹ لکھا جس سے مضمون کی حیثیت بھی مجروح نہیں ہوئی اور کوئی مصلحت بھی فوت نہ ہونے پائی، یہ ان کے تجربہ کار اور کار آشنا ہونے کی بات تھی۔

جب کبھی کچھ دیر ہو جاتی مضمون کے لئے تقاضا کرتے، خطوط لکھتے، میں بہت کمی کے ساتھ مگر کبھی کبھی ان کے دفتر میں چلا جاتا بڑے کام کی باتیں اپنے دل چسپ انداز میں سناتے واقعاتِ ماضی ان کو ازبر تھے، اشخاص و ادوار سے متعلق گفتگو کرتے تو بہت ساری معلومات کا اضافہ ہو جاتا حضرت علامہ عثمانیؒ، عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ مولانا حفظ الرحمٰنؒ مولانا ظفر علی خانؒ، مولانا غلام رسول مہرؒ، جگر مرادآبادی وغیرہ تاریخ ساز لوگوں کے بہت سے واقعات

بہت سی باتیں میں نے ان کے دل چسپ اندازِ بیان میں ان سے سنی ہیں، پھو کے لہجہ میں ان کی باتوں میں بڑا مزا آتا تھا۔ بقول کسے ؎

بہت لگتا ہے جی محفل میں ان کی ؛ وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

حافظہ بہت اچھا تھا اس لئے پرانی باتیں جزئیات کے ساتھ وہ بیان کرتے تو سننے والے کے سامنے پوری تصویر آجاتی تھی اور پیش پا افتادہ باتیں بھی ان کی رنگین بیانی سے تر وتازہ اور دلکش محسوس ہوتی تھیں ایک مرتبہ اپنی کتاب "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" عنایت کی، میں نے اسکو پڑھا اور نہ جانے کتنی بار پڑھا جب بھی پڑھا ہر مرتبہ نیا لطف آیا، سیکڑوں اربابِ علم وکمال حضرات کا تذکرہ انھوں نے اس کتاب میں کیا ہے، مگر ہر تصویر کو ان کے سحر طراز قلم نے پیکر محرک بنا دیا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے موصوف کے ممدوح ہمارے سامنے ہیں اور اپنے علمی وفنی کمالات کے ساتھ محو گفتگو ہیں، میں سمجھتا ہوں پیکر نگاری اور سیرت نگاری کے باب میں یہ کتاب صفِ اوّل کی کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ انشا کا حسن، بیان کی انفرادیت، لہجے کی متانت اور اپنے موضوع پر مکمل گرفت جیسی خصوصیات نے کتاب کو لازوال اور زندۂ جاوید بنا دیا ہے، مصنف کتاب نے مرحومین کو زندۂ جاوید بنایا اور زندہ جاوید شخصیات کے تذکرے نے مصنف کو بقائے دوام عطا کی ہے جس طرح شاہ جیؒ نے ڈوب کر عقیدت ومحبت کی فضاؤں میں رہ کر اخلاق واخلاص کی سیاہی میں ڈبو کر قلم اٹھایا ہے اس نے کتاب کو اور صاحبِ کتاب کو لازوال بنا دیا ہے، اردو ادب بجا طور پر ایسی کتابوں پر ناز کر سکتا ہے، مجھے یہ کتاب اتنی پسند ہے کہ میری رائے میں شاہ جی کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی اردو ادب میں یہ کتاب انھیں زندۂ جاوید بنا دینے کے قابل تھی، اب حال یہ ہے کہ ان کے سیکڑوں مضامین ہیں جو ان کی انفرادیت پرکشش اندازِ تحریر، سحر انگیز اسلوبِ بیان کی بنا پر ان کی بہترین یادگار ہیں جو آج ان کے بعد بھی ہمارے درمیان ان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے، میں نے اپنا مجموعۂ کلام "نور ونکہت" کے نام سے شائع کرنے کا پروگرام بنایا، شاہ جی سے میں نے اس کا تذکرہ کیا اور یہ بھی کہا کہ اس پر پیش لفظ بھی آپ لکھ دیں بہت خوش ہوئے اور بہت جاندار بہت جامع پیش لفظ لکھ کر میرے پاس بھجوایا، بغیر کسی تصنع کے کہوں گا کہ میری حیثیت سے زیادہ بلند پیش لفظ مرحوم نے لکھا جس سے ان کے اندازِ

حوصلہ افزائی اور خورد نوازی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مرتبہ بازار میں ملے میں نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے ہم تو اب تھک تھکا گئے ہیں اب تو آپ جیسے لوگوں کو ہی میدان سنبھالنا ہے۔

" نور د نکہت "، پر یوپی اردو اکیڈمی نے مجھے انعام سے نوازا تو بہت خوش ہوئے اور بڑے حوصلہ افزا کلمات کہے، کہنے لگے اب تمھاری نثر میں کوئی چیز آنی چاہئے تم ارادہ کرو اور مضامین کو مرتب کر دو میں اس کی اشاعت کا کوئی راستہ نکالوں گا۔

یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، مرحوم سخت علیل ہو گئے اور پھر یہ بیماری بالآخر سفرِ حیات کے اختتام پر ہی ختم ہوئی، مرحوم اعلیٰ درجہ کے ادیب اور بلند پایہ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت نکھرے ہوئے شعری ذوق کے بھی حامل تھے، اس کا بھی مجھے بارہا تجربہ ہوا، اساتذہ اور صفِ اول کے شعراء کے سیکڑوں اشعار انھیں یاد تھے اور جب وہ موڈ میں ہوتے اور مزے لے لے کر انھیں سناتے تو بہت زیادہ لطف آتا تھا، ایک مرتبہ بازار میں ملاقات ہو گئی مجھے روک کر کہنے لگے کچھ اشعار ہیں میر کے، سنو مزا آجائیگا، انھوں نے تقریباً ڈیڑھ درجن اشعار دہیں کھڑے کھڑے سنائے اور ایسے منتخب اور بلند پایہ اور معیاری اشعار سنائے کہ طبیعت باغ باغ ہو گئی میں کئی روز تک طبیعت میں ان کا مزا لیتا رہا، اپنے اشعار بھی کبھی کبھی سناتے تھے اور ان میں بھی ان کی ذہانت اور ادبی ذوق کی عمدگی اور بلندی نمایاں محسوس ہوتی تھی۔

اپنے والد بزرگوار علامۃ العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب قدس سرہٗ کا جیسا کہ چاہئے تھا بڑی عقیدت بڑی محبت سے ذکر فرماتے تھے، حضرت مرحوم کے واقعات بڑے والہانہ انداز میں سناتے تھے، ایک مرتبہ حضرتؒ پر مضمون لکھنے کو کہا، میں نے فرمائش کی تعمیل کی، "دارالعلوم" میں اسے شائع کیا، اور پھر کلماتِ تحسین کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی، ایک مرتبہ اپنی مرتب کردہ کتاب " حیاتِ انور " مجھے عنایت کی، یہ حضرت علامہ مرحوم کے حالات و کمالات پر ان کے بلند پایہ شاگردوں کے مضامین پر مشتمل ہے، میں نے اس بلند پایہ اور قیمتی کتاب کو جب بھی پڑھا ہے حضرت علامۃ العصر کے کمالات و محاسن زیادہ سے زیادہ نکھر کر سامنے آئے ہیں، اس نادرۂ روزگار شخصیت کا حق تو کون ادا کر سکتا ہے، ہم بعد والوں کے لئے یہ کتاب حضرت کے تعارف کا ایک بہترین اور کامیاب وسیلہ ضرور ہے۔

شاہ جی مرحوم ایک کامیاب صحافی ایک ممتاز ادیب ایک صاحبِ طرز اہل قلم ایک منفرد مبصر کی حیثیت سے سینوں اور سفینوں میں تادیر زندہ رہیں گے، ماہنامہ "دار العلوم" تقریباً ایک چوتھائی صدی سے زائد تک ان کی ادارت میں نکلا، اپنے معیار اپنے انداز اور بروقت اشاعت کے اعتبار سے آج تک وہ اپنی مثال آپ ہے، "دار العلوم" کے علاوہ نہ جانے کتنے اخبار، کتنے رسالے ان کے رشحات قلم سے مزین ہوئے ہوں گے، اس کا تذکرہ ایک مستقل مضمون کا طالب ہے، سچی بات یہ ہے کہ "شاہ جی" مرحوم کی وفات سے صحافت و ادب کی صفوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ تادیر شاید پورا نہ ہو، اس منزل سے ایک نہ ایک دن گذرنا سب کو ہے لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی وفات دوسروں کے لئے شدید احساسِ محرومی پیدا کر دیتا ہے اور یاد کرنے والے انھیں مختلف جہتوں سے انھیں یاد کرتے ہیں اور ان کی اچھائیوں کو دلوں میں جگہ دیتے ہیں، شاہ جی اپنی زندگی میں دوستوں کے دوست چھوٹوں کے بہی خواہ ملنسار وضعدار تھے ان کی یہ خوبیاں کیسے بھول سکیں گے؟ انھوں نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے مرنے والوں پر تعزیتی نوٹ لکھے ہوں گے آج وہ خود وہاں ہیں جہاں لوگ ان کے لئے اظہار تعزیت کر رہے ہیں، دنیا کا یہ سلسلہ یوں ہی چل رہا ہے، یوں ہی چلتا رہے گا ہمیشگی سوائے ذات واحد کے کسی کو نہیں اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَاخَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ، بڑے سے بڑا صاحبِ کمال، بڑے سے بڑا صاحبِ عظمت، بڑے سے بڑا صاحبِ جبروت، صاحبِ اقتدار بہرحال ایک نہ ایک دن پیوندِ خاک ہو جاتا ہے اور دنیا والوں کے لئے اپنی یادیں اور اپنے اچھے کام چھوڑ جاتا ہے جو اس کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں۔

بیماری کے دنوں میں ایک روز میں عیادت کے لئے گیا، ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی، تشویشناک خبریں بیماری کی مل رہی تھیں، پہونچا تو جس حالت میں شاہ جی کو دیکھا دل دہل گیا، بیماریوں کے شدید حملوں کی وجہ سے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتے تھے، طبیعت کو یقین سا نہیں آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو اپنی باغ و بہار شخصیت کے ساتھ جب بولتا تھا تو باتوں کی دلچسپی مخاطب کو ہمہ تن ان کی طرف متوجہ کر دیتی تھی، واقعات ماضی جب سناتے تو محسوس ہوتا کہ گذرے ہوئے زمانے کو زبان مل گئی ہے، آج وہ اس حال میں ہے

کہ زبان بند، آنکھیں بند، ہاتھ پاؤں بے حس و حرکت، صرف سانس کی آمد و رفت سے زندگی کے آثار کا پتہ چلتا تھا۔ میں ان کو دیکھ کر بہت متأثر ہوا۔ وقتاً فوقتاً طبیعت کے سنبھلنے بگڑنے کی اطلاعات ملتی رہیں تا آنکہ نومبر ۸۵ء کی آخری تاریخوں میں یہ سانحہ بھی پیش آگیا جو سب کو پیش آتا ہے لیکن اپنے اپنے وقت اپنی اپنی باری کی بات ہے، کوئی آگے چلا جاتا ہے کوئی پیچھے جاتا ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کے سیئات سے درگذر فرمائے اور مغفرت و رحمت عطا کرے۔

یہ چند سطور بطور یادگار، بطور تاثر سپرد قلم کی ہیں، اب ان کے بعد ان کے ذکر خیر کے علاوہ ہمارے پاس اور ہے بھی کیا؟ ؎

رونقِ بزم تھی وابستہ تمہارے دم سے
تم نہ ہوگے تو بہت یاد کرے گی دنیا

۱۹۷۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں میری طالب علمی کا چوتھا سال، دورۂ حدیث میں داخل تھا، اس لحاظ سے طلبہ میں گویا نمایاں اور تبصرے کرنے یا انتظامی امور میں تنقید کرنے کا مجاز تھا۔ دارالعلوم دیوبند ایک اسلامی دینی ادارہ ہے جس کا عام یونیورسٹیوں اور کالجوں سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا، اس لئے دوسرے اداروں سے قطع نظر یہاں کے طالب علموں کا یہ مزاج ہے کہ جب چند سال یہاں گذارلیں تو وہ اپنے آپ کو ہوشیار، مہذب اور تجربہ کار ثابت کرنے کے لئے حالات انتظامات اور کبھی کبھی بعض اساتذہ کے اسباق پر تبصرے کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جو طالب علم اپنی علمی مشغولیت سے وابستہ ہو وہ اپنا یہ اختیار استعمال نہ بھی کرے تو کم سے کم ان تبصروں کو سننے پر مجبور ہوگا۔

چنانچہ دورۂ حدیث یعنی فراغت کے سال میں طلبہ میں جو شکایتیں ہوا کرتی تھیں ان میں ایک یہ تھی کہ رسالہ "دارالعلوم" کا معیار باقی نہیں رہا، یا یہ کہ "ایڈیٹر دارالعلوم" اب کچھ لکھتے نہیں بلکہ الٹے سیدھے مضامین چھاپ دیتے ہیں۔

کچھ اسی قسم کے تبصرے عام طور پر طلبہ کرتے اور گویا اپنی رسالہ بینی اور مطالعہ کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی عام طلبہ مدارس عربیہ کی طرح اخبار و رسائل یا تاریخ و ثقافت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اس لئے ان تبصروں پر یقین سا آجاتا، پھر دارالعلوم سے فراغت کے بعد مطالعہ کا کچھ شوق ہوا، اخبار و رسائل سے دلچسپی ہوئی جب صحیح طور پر معلوم ہوا کہ رسالہ دارالعلوم کیا ہے اور اسکے مدیر کون ہیں۔

رسالہ دارالعلوم مسلکِ اکابر، اہل سنت والجماعت، دیوبندی مکتبِ فکر اور اسلامی روایات کا ترجمان تھا جس کے مدیر اعلیٰ تھے مولانا سید ازہر شاہ قیصر، فرزند اکبر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح،

لیکن چونکہ ایک تاثر یہ قائم ہو چکا تھا کہ رسالہ دار العلوم بس یوں ہی سا ہے اور محترم مدیر اس کے معیار کو بلند کرنے میں کوئی رغبت نہیں رکھتے اس لئے رسالہ سے بھی ہمیں دلچسپی نہ ہو سکی، ہاں مدیر محترم جناب ازہر شاہ صاحب کا صورت آشنا ضرور ہو گیا۔

وقت گذرتا گیا پھر میں جب دار العلوم کے دفتر "الداعی" (عربی) میں ملازم ہوا تو دیگر کارکنانِ دار العلوم سے بھی تعارف ہوا، دفتر الداعی کا محل وقوع کچھ اس طرح تھا کہ احاطہ مولسری میں دفتر تعلیمات کے سامنے سے جب اترنا ہوتا یا دفتر اہتمام کا رخ ہوتا تو دفتر رسالہ دار العلوم پر نظر پہلے پڑتی اور سامنے ہی ازہر شاہ صاحب نظر آتے اور صبح کے وقت وہ اکیلے نہیں ہوتے تھے، ان کے دفتر میں بعض اساتذہ اور منتظمین کا اجتماع رہتا تھا، ہمیں یہی احساس رہتا کہ یہ سب حضرات اپنے علاوہ مدیر محترم کا بھی وقت ضائع کرتے ہیں۔

اس نشست میں عام طور پر سید محبوب رضوی مرحوم، مولانا محمد اسلم قاسمی، عبداللہ جاوید، عبداللہ سلیم، قاری نعمان، حکیم عزیز الرحمٰن کے علاوہ مولانا انظر شاہ مسعودی، مولانا محمد عثمان مرحوم، مولانا عبدالحق پیشکار مرحوم، مفتی ظفیر الدین، مولانا محمد گل مرحوم وغیرہ نظر آجاتے تھے، شاہ برادران کی موجودگی میں نام لئے بغیر اگر صرف شاہ جی کہا جاتا تو مولانا ازہر شاہ صاحب ہی مراد ہوتے، اور مولانا انظر شاہ صاحب کو "شاہ صاحب" کا لقب دیا جاتا، گویا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں شاہ کے درمیان "جی" اور "صاحب" کا حدِ فاصل قائم کرکے امتیاز کر دیا جاتا، یا پھر بڑے شاہ جی اور چھوٹے شاہ جی کہلاتے۔

۱۹۷۷ء کی بات ہے، جب الداعی کا اجراء ہوا مولانا وحید الزماں کیرانوی کے زیر نگرانی مولانا بدر الحسن قاسمی اور میں نے دفتری نظم ونسق مکمل کر لیا تھا، لیکن ہم دونوں نو آموز کو مولانا وحید الزماں صاحب ہدایات دیتے، الداعی کی ترتیب اور دفتری امور میں رہنمائی کرتے، ہمیں پھر بھی پریشانی تھی کہ مکمل رہنمائی نہیں مل پا رہی تھی، اسی اثناء میں ایک روز صبح کے وقت کسی معاملہ میں مولانا عبدالحق مرحوم سے معلومات کے لئے دفتر اہتمام کا رخ کیا، سامنے ازہر شاہ صاحب اکیلے بیٹھے تھے دیکھتے ہی بولے "بیٹا اسلام، ادھر تو آؤ"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس ایک جملہ میں کس درجہ شفقت اور توجہ تھی، فوراً ہی ان سے ذرا دور "با ادب با ملاحظہ" کے انداز میں بیٹھ گیا، فرمایا کیا کر رہے ہو؟

دفتری نظم ونسق کی کیا صورت ہے؟ کچھ تجربہ بھی ہے یا نہیں؟

میں نے عرض کیا، شاہ جی! ہمیں تو اس کا تجربہ بھی نہیں، اور نہ یہ معلوم کہ دارالعلوم کے دفاتر کی ترتیب، رجسٹر وغیرہ کی خانہ پُری کس طرح ہوگی، کہنے لگے چلو اطمینان سے بیٹھ جاؤ میں بتاتا ہوں، پھر وہ بہت سی باتیں بتانے لگے جس سے مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑی آسانی ہوئی تھی، کہنے لگے چلو کل پھر آنا مزید رہنمائی کروں گا۔

اب ظاہر ہے کہ جو دوری ایک طرح سے تھی وہ ختم ہوچکی تھی اور پھر انھوں نے جس شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کیا تھا اس کے ردعمل میں انسیت ہوگئی، دوسرے دن ان کے دفتر میں حاضر ہوا تو انھوں نے کہا کچھ پاکستانی معزز شخصیات اور اداروں کے پتے لکھو جن پر تمھیں الداعی بھیجنا ہے وہ املا کراتے رہے اور میں لکھتا رہا، جب پچاس سے زائد پتے ہوگئے تو کہنے لگے پھر لکھ لینا، میں نے کہا شاہ جی! آپ نے یہ پتے زبانی اس طرح لکھوائے جیسے آپ پاکستان کا سفر بارہا کرچکے ہوں، جواب دیا کہ بیٹے! صرف ایک بار وہ بھی تقسیم سے قبل، مجھے بڑی شدید حیرت ہوئی کہ اتنے پتے اس طرح حافظہ میں ہوں، کیسے ہوسکتا ہے۔

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب مجھے اس حقیقت کا پوری طرح علم نہیں تھا کہ شاہ جی محدثِ عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح کے وارث ہیں جن کا حافظہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اور فرزندِ اکبر نے اپنے والدِ بزرگوار سے قوتِ یادداشت وراثت میں پائی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھ پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ ازہر شاہ کی شخصیت اپنے اندر بے پایاں خوبیاں رکھتی ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خوردوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی تو ان کی فطرت بن چکی ہے۔

چنانچہ ایک دفعہ مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم اور مولوی بدرالحسن صرف عربی ہی سے وابستہ رہوگے یا اردو میں بھی اپنی صلاحیت آزماؤ گے؟ ہمہ جہت اور ہمہ صفت بنو۔

میں نے کہا اردو میں بھی لکھنے کا شوق ہے جسے پورا کرتا ہوں، علمی مضامین لکھنے کی کوشش کرتا ہوں، کہنے لگے کہ لکھو اور مجھے دو میں دارالعلوم میں شائع کروں گا اور تمھیں ترقی کے مواقع فراہم کروں گا، حیرت ہوتی تھی کہ اس زمانے میں بھی ایسے لوگ ہیں جو فرزندانِ دارالعلوم کو اپنے

حوصلہ افزا باتوں کے علاوہ مواقع فراہم کرنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں جب کہ فی زمانہ ایسا مزاج بن گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے میدان میں اترتا ہے اور زور آور ثابت ہوتا ہے تو اسے مختلف طریقوں سے پچھاڑنے اور نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وقت اور آگے بڑھا جب شاہ جی مرحوم نے اپنی عنایتوں اور شفقتوں سے مجھ جیسے ناتجربہ کار اور کم عمروں کو ایک حیثیت اور مرتبہ دیا اور بے تکلفی کے ساتھ ہر علمی تاریخی، ثقافتی موضوع پر گفتگو کرنی شروع کی تو وہ بات کہہ دی جو طالب علمی کے دوران میرے ذہن پر نقش کر دی تھی، عرض کیا: کہا جاتا ہے کہ رسالہ دارالعلوم کا وہ معیار نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا اس کی کیا وجہ ہے؟ یا پھر اس میں کس حد تک صداقت ہے۔

ان کا جواب رسالہ دارالعلوم کی تاریخ پر محیط تھا اور ان واقعات وحقائق پر مبنی جسے کوتاہ ذہن افراد کے فکر ونظر کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی، رسالہ کے معیار میں کوئی کمی نہیں آئی لیکن اگر کوئی "کمی" تھی تو یہ کہ وہ دارالعلوم کے ان فضلاء کو نمائندگی دیتے رہے جن میں شعور تھا، آگہی تھی، سلیقہ تھا، علم تھا اور جنھیں حوصلہ افزائی کے لئے مدیر رسالہ دارالعلوم حضرت مولانا ازہر شاہ قیصر مواقع فراہم کرتے رہے۔

ورنہ اگر وہ چاہتے تو از خود مکمل رسالہ کے لئے مضامین کا انبار لگا دیتے، تاریخی واقعات اور سیاسی نکتہ آفرینیوں میں تو وہ یکتائے زمانہ تھے، دوسرے رسالوں اور اخباروں کی فرمائش پر وہ برابر لکھتے رہے اور ادبی انفرادیت کے ساتھ اخیر عمر تک جلوہ گر رہے۔ اور ان کی تحریر جس میں ادب کی پختگی، فکر ونظر کی گیرائی، سلاست اور شگفتگی کا منفرد اسلوب موجود ہے آج بھی صحافیوں اور ادیبوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

صحافت میں انھوں نے نصف صدی تک اپنے جوہر دکھلائے، ہند وپاک کے مؤقر رسالے اور اخبارات ان کی تحریروں سے مزین ہوئے اور ان کی یہ تحریریں ہی ان اخبارات ورسائل کے لئے باعثِ فخر ہوتیں۔

واقعات نگاری ان کا انفرادی اسلوب ہے، تاریخی واقعات، اکابر دارالعلوم، مجاہدین آزادی برصغیر ہند کے قلمکاروں اور شاعروں کے واقعات کو اپنی تحریر اور زبانی بھی اس طرح بیان

کرتے کہ ہر پہلو نمایاں ہو جاتا، اور ان کے موروثی حافظہ نے ان خصوصیات کو دوبالا کر دیا تھا، حوالے اور مستندات کا ذکر ان کے مضامین میں بھی ملتا ہے اور ان کی مجلسوں میں بھی سنائی دیتا۔

ایک دفعہ ان سے سوال کیا کہ آپ کے دفتر میں تقریباً روزانہ ہی مجلس ہو جاتی ہے اور سب سلجھے ذہن اور اچھی نظر رکھنے والے افراد ہوتے ہیں، آخر کس کس موضوع پر گفتگو ہوتی ہے ؟ یا یوں ہی وقت ضائع ہوتا ہے۔ کہنے لگے کسی دن آجاؤ۔ ایک دن خود ہی بلوایا، پھر اپنا دفتری کام رسالہ کی ترتیب وغیرہ مکمل ہوتی تو خود ہی حاضر ہوتا رہا۔

یہ مجلس ہم جیسوں کے لئے ایک تجربہ گاہ تھی، تاریخ کے اوراق کھلتے۔ اکابرِ دارالعلوم کے کارنامے اور خدمات آشکارا ہوتیں دارالعلوم کے اہم مسائل (جو غیر انتظامی ہوتے) زیر بحث آتے، ادیبوں کے تذکرے، شاعروں کے تجزیے، ملکی اور بین الاقوامی حالات پر تبصرے، علمی مباحث پر تحقیق و تنقیح، مسلمانوں کے دینی حالات اور معاشرے کی اصلاح کے طریقے، بیان ہوتے پھر خورد و نوش کی باتیں، پُر وقار مزاحیہ جملے اور معلوماتی چیزیں پیش ہوتیں۔

ہم جیسے نو آموز اور حالات سے مکمل آگاہی نہ رکھنے والوں کے لئے یہ مجلس ایک نعمت تھی جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا، سمجھا، حاصل کیا۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس مجلس کے تمام افراد دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کے انتظام میں منہمک ہوئے تو اس بین الاقوامی اجتماع کو کس خوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

لیکن چشم بینا طرح طرح کے تماشے دکھاتی ہے، کبھی دوسرے کی آنکھوں کے تنکے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی اپنی آنکھ کا شہتیر بھی چھپا لیتی ہے، اجلاسِ صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں ایسے ہنگامے ہوئے کہ جس میں کچھ لوگوں کو دارالعلوم کی انتظامیہ میں ہر طرح کا نقص دکھائی دینے لگا، اپنے عیوب نہیں دکھائی دیئے، ان سازشوں اور ہنگاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کا ایک سنہرا دور ختم ہو گیا۔

شاہ جی کی یہ مجلس بھی ختم ہو گئی، سید محبوب رضوی پہلے ہی انتقال کر گئے تھے، باقی ماندہ افراد کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ شاہ جی رسالہ دارالعلوم سے جدا ہوئے تو بجھ سے گئے، طبیعت کی شگفتگی ختم ہو گئی، ولولے پژمردہ ہو گئے، دارالعلوم کے انتشار کا غم انھیں بے بسی اور بے کسی کی

حالت میں لے آیا۔

اس دوران میں نے اپنا عربی ماہنامہ "الثقافہ" جاری کرلیا تھا، اور ہم لوگوں کے مربی و محسن، کاروانِ دارالعلوم کے سالارِ اعظم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی ہم سے جدا ہوگئے۔

شاہ جی کے مشورے پر مولوی نسیم اختر شاہ قیصر نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک اردو ماہنامہ "طیّب" کے اجرار کا ارادہ کیا، شاہ جی کی عنایتیں راقم الحروف کے ساتھ اس وقت بھی رہیں انھوں نے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے مجھے اس رسالے سے وابستہ کردیا اور کہا کہ اردو میں بھی لکھتے رہو، ابھی تم لوگ جوان ہو، حوصلہ ہے، موقع ہے، حالات اور پریشانیوں سے مقابلہ کرو، جد وجہد جاری رکھو۔

رفتہ رفتہ شاہ جی بھی اپنی تحریروں سے نوازتے رہے۔ میں چند ماہ کے بعد اپنی مصروفیات کی وجہ سے ادارت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگیا، پھر بھی ان کا اصرار رہا کہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔

پھر شاہ جی جب بیمار ہوئے تب بھی املار کراتے رہے تا آنکہ ۲۷ر نومبر ۸۵ء کو اسی طویل علالت میں انتقال ہوگیا اور اپنے والد ماجد علامہ انور شاہ کشمیری رح کے مزار کے برابر میں مدفون ہوئے۔

بلاشبہ ان کو معمارِ ادب و صحافت اور بلند پایہ صحافی کہا جائیگا جنھوں نے تقریبًا ۵۰ر سال تک قوم کی خدمت کی، دارالعلوم دیوبند کی ترجمانی کے فرائض انجام دیئے اور چار ہزار سے زائد مضامین لکھے جو علمی، اصلاحی، تاریخی، سیاسی، دینی اور ادبی مواد پر مشتمل تھے۔

وہ بالغ نظر صحافی اور نہایت ہی ذہین قلمکار تھے، انھیں شخصیات پر سوانحی مضامین لکھنے کا ملکہ تھا جسے وہ خوب سے خوب تر بنا دیتے، ان کی تصنیف "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" اس حقیقت کی دلیل ہے۔

ان کی دیگر تصانیف "حیاتِ انور" "متفرقات"، "سفینۂ وطن کے ناخدا"، "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا"، ان کی تحریروں کے بعض نمونے ہیں ورنہ ان کی تخلیق کا بیشتر حصہ ان رسالوں میں موجود ہے جس کی وہ خود ادارت کرتے رہے، ماہنامہ صداقت، انور، ہادی، خالد، دارالعلوم، طیّب یہ وہ رسالے تھے جنھیں انھوں نے اپنے فکر و فن سے آراستہ کیا اور دوسرے اخباروں مثلاً زمیندار، احسان، انقلاب وغیرہ میں بھی ان کے مضامین نمایاں طور پر

شائع ہوتے رہے۔ اور رسالہ دارالعلوم کی ترتیب، اشاعت اور ترسیل میں ان کے کمال کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ چالیس سال کے عرصہ میں صرف ایک دفعہ یہ رسالہ اپنے وقت پر شائع نہ ہوا۔ ورنہ کبھی تاخیر نہیں ہوئی جو تاریخ صحافت کا ایک ریکارڈ ہے۔

یہ تو ان کی زندگی کے بعض گوشے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح ملک وقوم اور دارالعلوم دیوبند کی خدمت کی اور کس طرح صحافت و انشاپردازی کے لئے نئی نسل کو تعمیر کیا اور انھیں پروان چڑھنے کا موقعہ دیا۔

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

جناب ڈاکٹر تابش مہدی صاحب

سوچتا ہوں کیا لکھوں؟ اور کہاں سے لکھوں؟ معاملہ کسی ایسے ویسے کا نہیں، بلکہ مولانا سیّد ازہر شاہ قیصر کا ہے، وہ ازہر شاہ قیصر جو بیک وقت عالم دین بھی تھے اور بے باک صحافی بھی، ایک کہنہ مشق صاحب قلم و انشا پرداز بھی تھے اور خوش فکر شاعر بھی، ایسی یک رنگ و صد رنگ شخصیت کو قلم کا سہارا لے کر کاغذ پر پیش کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں، یہ کام قلم کا نہیں موئے قلم کا ہے، اور میں اس فن میں بالکل کورا ہوں پھر بھی ہمت کر کے لکھنے بیٹھ گیا ہوں، یہ سوچ کر کہ اگر کامیاب ہوگیا تو مضمون نگار ہوں ہی اور اگر کامیاب نہ ہوسکا تو شہیدوں میں تو شمار ہو ہی جائیگا — سودا کسی صورت میں گھاٹے کا نہ ہوگا۔

"دراز قد، فربہ جسم، سرخ و سفید چہرہ، پانوں کی کثرت سے سرخ ہونٹ اور پان زدہ دانت، سنہری فریم کی عینک اور ان میں سے جھانکتی ہوئی تیز اور ذہین آنکھیں اور کناروں پر سرمہ کی گہری لکیریں کشادہ پیشانی اور اس پر غرور علم و تقدس کی مظہر سلوٹیں، منڈا ہوا سر اور اس پر دو پلی مگر نوکدار ٹوپی، یکمشت و دو انگل کے معیار پر پوری اترتی ہوئی ادھ پکی داڑھی، شخصیت کو مزید باوقار بناتا ہوا شانوں پر تکنا رومال، ایک ہاتھ میں قلم و کاغذ اور پاندان سے بھرا ہوا پرس (منی بیگ) اور دوسرے ہاتھ میں نازک سی چھڑی ——— یہ تھا شاہ صاحب کا وہ خیالی پیکر جو میرے صفحۂ ذہن پر اس وقت ابھرا تھا جب میں نے پہلے پہل رسالہ "دارالعلوم" دیوبند کے مدیر کی حیثیت سے ان کا نام اس طرح دیکھا تھا "ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصرؔ" غالباً یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے پھر خدا جانے کیوں دل نے یہ بے ساختہ تقاضا کیا کہ میں ان سے ملاقات کروں، لیکن کوئی موقعہ میسّر نہ آسکا، اللہ کی طرف سے جس کام کے لئے جو وقت مقرر ہو چکا ہے اس سے پہلے ہو جانا

ممکن بھی نہیں ہے، انسان مجبور بھی ہے وہ صرف کوشش کر سکتا ہے اور بس۔

۱۹۷۴ء میں شاہ صاحب کے برادر زادے برادرم مولانا احمد خضر شاہ مسعودی (ابن مولانا سید انظر شاہ مسعودی) سے رسم وراہ ہوئی، پھر اس رسم وراہ نے گہرے تعلقات کی شکل اختیار کرلی میں ان دنوں دارالعلوم امروہہ میں کام کر رہا تھا اور عزیز موصوف مدرسہ شاہی مرادآباد میں زیر تعلیم تھے۔ ان کے دوستانہ اصرار پر میں نے عید قرباں کی چھٹیاں دیوبند میں گذارنے کا پروگرام بنایا دیوبند کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا، احمد میاں نے دیوبند اور دارالعلوم کے متعدد علماء واکابر سے ملاقاتیں کرائیں، میرے فکری استاذ اور ایشیا کے عظیم ترین اہل قلم، صحافی، شاعر ناقد اور عالم دین حضرت مولانا عامر عثمانی سے مراسلت ومشورت کا سلسلہ تو ایک عرصہ سے قائم تھا مگر انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کچھ سننے سنانے کا یہ پہلا سنہری موقع اسی سفر میں میسر آیا، مولانا شریف الحسن صاحب شیخ الحدیث، مولانا فخر الحسن صاحب صدر المدرسین، مولانا سید انظر شاہ استاذ حدیث دارالعلوم سے شرف ملاقات اسی سفر میں حاصل ہوا، مشہور مؤرخ مولانا سید محبوب رضوی صاحب کو پہلی بار یہیں دیکھا۔

ایک روز احمد میاں کے ہمراہ محلہ خانقاہ میں "آستانۂ انور شاہ کشمیری" پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، وہاں انھوں نے کئی دوستوں سے تعارف کرایا، ہم لوگ بیٹھے شعر وادب کی باتیں کر رہے تھے اسی اثناء میں فائل در بغل ایک بزرگ نمودار ہوئے، نووارد بزرگ میں کوئی کشش بظاہر محسوس نہ ہوئی لیکن میں نے دیکھا کہ ان کو دیکھتے ہی سب لوگ کھڑے ہوگئے، یہ کھڑا ہونا بھی رسماً اور تکلفاً نہ تھا، بلکہ اپنے جلو میں ادب واحترام کی غیر معمولی کیفیت لئے ہوئے تھا، ادب واحترام کی وہ کیفیت جو واقعی کسی عظیم ومعزز شخصیت کے ساتھ ہونی چاہئے، معاً مشہور اسلام پسند شاعر جناب حفیظ میرٹھی کا یہ شعر صفحۂ ذہن پر ابھر کر آگیا ؎

انجمن میں آکے سب سے گرم جوشی سے ملا
ایک نووارد جسے جانے نہ پہچانے کوئی

حالانکہ وہ نووارد صرف میرے ہی لئے تھے دوسرے حاضرین کے لئے نہیں۔

"یہ مولانا سید ازہر شاہ قیصر ہیں" ___ میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے سرگوشی کے انداز میں بتایا ___ یہ سنکر میری آنکھیں چوندھیا گئیں، کافی دیر تک یقین ہی نہیں آیا کہ یہی ہیں وہ ابن الانور

مولانا سید ازہر شاہ قیصر جن کے شگفتہ و پُر بہار قلم نے رسالہ دارالعلوم کے صفحات کے ذریعہ نہ جانے کتنے قلوب کو جیت لیا ہے اور نہ جانے کتنے اذہان کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔

دل نے کہا ہرگز نہیں یہ ازہر شاہ قیصر نہیں ہوسکتے یہ نوجوان مذاق کے موڈ میں ہے اس لئے کہ نووارد بزرگ شکل وصورت اور ظاہری ہیئت کے اعتبار سے نہ تو ابن الانور معلوم ہورہے تھے اور نہ شاہ اور قیصر، پھر کچھ دیر بعد ہم سب ان کی شستہ وشگفتہ اور پر مغز وباوقار گفتگو میں کھو گئے، آنے والا ہر لمحہ ریب وتشویش کی جھاڑیوں کو کاٹتا چھانٹتا اور صاف کرتا گیا، اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا کہ دل یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ یہی ہیں یگانۂ روزگار علامہ سید انور شاہ کشمیری ؒ کے فرزند کبیر اور ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر باتمکین۔ البتہ میرا وہ خیالی پیکر ریزہ ریزہ ہوگیا جو میں نے ایک مدت سے شاہ صاحب کے تعلق سے ذہن میں بنا رکھا تھا۔

موصوف مرحوم کا جسم خالص غیر مولویانہ تھا۔ اور قد ایسا تھا کہ ثریا حماقت کی روایت وابستہ نہ کی جاسکے، ان کا چہرہ پندار زہد وتقدس کے بجائے خلوص وعجز کے نور سے دمک رہا تھا، کھلی ہوئی پیشانی کبر ونخوت کے بجائے فہم ودانائی کی غماز تھی، جسم پر کبھی کبھی شیروانی بھی ہوتی تھی اور سر پر انور کیپ بھی مگر اظہار علم وشرافت کے لئے نہیں بلکہ تحفظ تہذیب وتمدن کے لئے وہ اسی کو اپنی دولت اور سرمایہ تصور کرتے تھے، ان کی آنکھیں گہری ضرور تھیں مگر چالاکی اور عیاری سے محفوظ اور متانت و سنجیدگی کی آئینہ دار، شانوں پر رومال رکھتے بھی دیکھے گئے ہیں مگر بوقتِ ضرورت۔

"آستانۂ انور" کی اس مختصر سی ملاقات کے بعد نہ جانے کس جذبے سے مجبور ہوکر میں ان کی طرف کھنچتا ہی چلا گیا، دیوبند میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد جب بھی میں ان سے ملا ان کے پرخلوص اور مشفقانہ رویے میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

شاہ صاحب نے جس عہد میں شعور کی آنکھیں کھولیں وہ علمی اور ادبی لحاظ سے نہایت روشن اور تابناک تھا خود ان کا دیوبند بھی موجودہ دیوبند سے بہت مختلف تھا، شاہ صاحب نے ہوش سنبھالا تو انھیں ہر طرف علم وحکمت اور شعر وادب کے چرچے سنائی دیئے۔ اور

ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد

کے مصداق وہ بھی اسی رنگ میں رنگ گئے، شعر وادب ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا، رسائل میں

ان کی نگارشات شائع ہونے لگیں، ارباب علم وفن سے شناسائی اور اس عہد کے اکثر نقاد اور ادباء وشعراء اور ارباب قلم سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا، ان میں سے حضرت جگر مرادآبادی، علامہ شفیق جونپوری مولانا ماہرالقادری، عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا ظفر علی خاں، سیماب اکبرآبادی، نازش پرتاپ گڑھی، علامہ تاجور نجیب آبادی، روش صدیقی، مظہر علی اظہر اور احسان دانش وغیرہ کے خطوط ان کے فائل میں اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں، ان ارباب فکر و دانش سے نہ صرف یہ کہ مرحوم کا گہرا تعلق ہی رہا ہے بلکہ ان کے نزدیک مقبول وہر دلعزیز بھی رہے ہیں اور ان سب کا انھیں اعتماد حاصل رہا ہے۔

مشہور شاعر سیماب اکبرآبادی نے جب منظوم ترجمۂ قرآن (وحی منظوم) کی تکمیل کرلی تو اس پر مقدمہ لکھنے لکھانے کی ذمہ داری مرحوم کے سپرد کی اور خط لکھا کہ:

محب مکرم السلام علیکم

کارڈ پہونچا، رمضان المبارک کی یکسوئی طلب ساعتوں میں میری متواتر زحمت دہی دخل در معقولات تو ضرور ہے مگر کیا کروں جو سلسلہ ایک مدت سے چھڑا ہوا ہے اسے ختم کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا، امید کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

ترجمہ منظوم کے جو اقتباسات میں نے مولانا گیلانی صاحب کو حیدرآباد بھیجے تھے وہی آج حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی خدمت میں براہ راست بھیج رہا ہوں، جانتا ہوں کہ وہ مصروف ہیں اور ۹ر اگست ۱۹۴۷ء کی شام تک انھیں کراچی بھی پہونچنا ہے مگر آپ نے اگر پوری توجہ سے کام لیا تو ان کی رائے لے لینا مشکل نہیں ہے، صرف چند منٹ ترجمہ کے دیکھنے اور چند منٹ چند سطریں لکھنے میں صرف ہوں گے، مجھے ان کی رائے لینے کی بڑی تمنا ہے اور اسی غرض سے میں دیوبند بھی گیا تھا مگر وہ اس وقت میری بدقسمتی سے علیل تھے پھر بھی میں ان کے اخلاقِ عظیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

جن حضرات گرامی کے اسماء عالی آپ نے مقدمہ کے لئے لکھے ہیں اپنی نارسائی کی وجہ سے میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا، وہ یقیناً صاحب علم وفضل ہوں گے مگر خیر ...... اگر مولانا عثمانی کسی طرح مقدمہ نگاری پر رضامند ہوجائیں تو یہ سب سے بڑی

کامیابی ہوگی ورنہ اس تمام جدوجہد کے بعد یہی بہتر ہے کہ میں آپ ہی کو اس کارِخیر کے لئے زحمت دوں اور مجھے دردر کی بھیک نہ مانگنی پڑے۔ ایک کامیاب کوشش مولانا عثمانی کے لئے اور کر دیکھئے اور اس کے بعد ان سے اقتباسات لے کر خود ہی بسم اللہ کیجئے، میں مقدمہ میں جو باتیں بطور خاص چاہتا ہوں وہ پھر کسی خط میں لکھ دوں گا،

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے

دُعا گو۔ "سیماب"

رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی مرحوم کی غزل پہلی بار شاہ صاحب کے ذخیرہ خطوط میں اور جگر صاحب کی اپنی تحریر میں پڑھنے کو ملی۔

کس کا خیال ہے دلِ مضطر لئے ہوئے ۔۔۔ آنسو ہیں رنگ و بوئے گُل تر لئے ہوئے

کونین کی ہوس میں ہے انساں ذلیل و خوار ۔۔۔ کونین اپنے سینے کے اندر لئے ہوئے

یادش بخیر پھر ہے اسی رہ گذر کی یاد ۔۔۔ گذرے تھے ہم جہاں سے کبھی سر لئے ہوئے

اللہ رے بے بسی کہ غم روزگار بھی ۔۔۔ بیٹھا ہوں تیرے غم کے برابر لئے ہوئے

شرم گنہ سے بڑھ کے ہے عفو گناہ کی شرم ۔۔۔ یارب کہاں میں جاؤں یہ نشتر لئے ہوئے

راقم الحروف کی ادبی تربیت ایک ایسے ماحول (امروہہ) میں ہوئی جہاں الفاظ بولے نہیں، ڈھالے جاتے ہیں، الفاظ کی دیکھ بھال اور فن کی پاسداری "مزاجِ محبوب" سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ کی جاتی ہے، شعروادب کے قدیم وجدید لوازم، فصاحت وبلاغت، تلفظ اور الفاظ کے محلّ استعمال کا غیرمعمولی التزام کیا جاتا ہے، کسی گفتگو میں حصہ لینے کے لئے غیرمعمولی تیاری کرنی پڑتی ہے، عام مجلسوں میں بھی کافی محتاط اور بیدار رہنا پڑتا ہے، اگر کسی نے "کیا" کے بجائے "کرا"، ہچکیوں یا ہچکیاں کے "ہچکی"۔ رِضائی" کے بجائے "رَضائی" (رامفتوح) یا "آپ" کے بجائے "تُو" وغیرہ بول دیا تو سمجھئے کہ اس کی شامت آگئی کئی روز اس پر تنقیدیں ہوں گی، اس کی اخلاقی وتہذیبی روش پر گفتگو ہوگی، ایک لفظ کی تحقیق میں ہفتوں صرف کیا جانا وہاں کا عام معمول ہے، ایسے شعراء وادباء کی قابلِ ذکر تعداد وہاں آج بھی موجود ہے جن کے کلام سے استناد کیا جاسکے یا ان کی تحریریں حوالے کے طور پر نقل کی جاسکیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی شاعر یا مضمون نگار خواہ کتنا ہی بڑا اور مقبول کیوں نہ ہو میرے نزدیک زبان وبیان کی بعض معمولی کوتاہیوں

کے سبب نا قابلِ التفات ہوتا ہے، یہ میری کمزوری ہے اس خصوص میں میں خود کو مجبور پاتا ہوں مجھے اس بات کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ شاہ صاحب نے ان لوازم کو کما حقہ نہیں برتا، متروکات اور نا قابلِ استعمال الفاظ کو بھی اپنے ہاں بڑی فراخ دلی کے ساتھ جگہ دی ہے، لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ان کی نثر میں بلا کا رچاؤ، غضب کا مٹھاس اور بے انتہا والہانہ پن پایا جاتا ہے۔ یوں تو شاہ صاحب ادیب بھی تھے، شاعر بھی، صحافی بھی تھے اور سوانح نگار بھی مگر راقم الحروف کی رائے میں ان کی سوانح نگاری ان کی جملہ اصناف پر غالب تھی، وہ جب کسی شخصیت کا تعارف کرانے کے لئے قلم اٹھاتے تھے تو پہلے خود اس میں گم ہوجاتے تھے اس کے بعد ان کے قلم کے ذریعہ جو شخصیت برآمد ہوتی تھی وہی اس کا اصلی روپ ہوتا تھا، وہ اس سلسلے میں افراط و تفریط کے قطعی قائل نہ تھے، راقم الحروف نے جب بھی ان کے شخصیاتی مضامین پڑھے خود کو صاحبِ مضمون کے ہمراہ دہم رکاب محسوس کیا میرے نزدیک یہی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس سلسلے میں ان کے مضامین علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ کشمیری مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، عطاء اللہ شاہ بخاری، جگر مرادآبادی، احسان دانش بطور ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں، علامہ کشمیری پر لکھے گئے مضمون کا یہ اقتباس تو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے

" یہ بتانے کی بات نہیں کہ آب وہوا کی خوش گواری، موسم کا اعتدال، مناظر کی رنگا رنگی پھولوں اور میووں کے قسم قسم کے ذائقے صرف انسان کے ظاہری حسن و جمال ہی میں اضافہ نہیں کرتے اور صرف وہ انسان کی تندرستی اور صحت جسمانی کے لئے ہی کارآمد نہیں بلکہ وہ صحت مند دماغ تندرست ذہن علمی مذاق رکھنے والی طبیعتیں، شاعرانہ مذاق اور صناعی و فنکاری کی صلاحیتوں کو پیدا کرنے بڑھانے و نشو ونما دینے میں بھی پوری اعانت کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی سرزمین پر حسن فطرت کی آغوش میں علم و کمال نے آنکھ کھولی قدرتی چشموں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی کر شاعری اور ادب نے آغوں آغوں کرتے ہوئے صاف بولنا شروع کیا، بادِ صبا کے بار بار آتے ہوئے جھونکوں سے حکمت و دانائی کے لب بستہ غنچے کھل پڑے اور رنگ برنگ کے پھولوں ننھی ننھی کلیوں، چھوٹے چھوٹے پودوں اور مہوشانِ سیم تن کی رگ جسم سے بھی زیادہ باریک شاخوں کی ہم نشینی سے ذکاوت و ذہانت نے جلا پائی (یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ ص)

عطاء اللہ شاہ بخاری رح کی وفات پر لکھتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

"صفِ اول کے لوگوں میں گاندھی جی اور جواہر لال تک میرے قریب سے گرج برس کر گذر گئے لیکن میں نے ذاتی طور پر ان سے تعلق پیدا کرنے میں اپنا نقصان سمجھا ، اور ان بزرگوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرا تعلق بہت قدیم مستحکم اور نیاز مندانہ رہا ہے ۔"

(یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ ص ۱۶)

ان سطور میں شاہ صاحب کی قلندرانہ زندگی کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے ۔ حضرت جگر مرادآبادی جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے قلم نے باہیں انداز خراج عقیدت پیش کیا :

"مجھے جگر صاحب سے عقیدت نہیں تھی ، جگر صاحب عقیدت کے قابل کوئی چیز بھی نہیں تھے یا یوں سمجھئے کہ میری زندگی اور میرے ذہن میں عقیدت کا کوئی خانہ ہی نہیں ، مگر ہاں جگر صاحب سے ایک تعلق تھا ان کے مزاج کی آشفتہ سری اور ناہمواری کے باوجود ان سے محبت تھی ، ان کے وحشتناک چہرے اور بے تکے بالوں کے باوجود ان سے لگاؤ تھا اور کچھ ایسی محبت تھی جیسے محبت کرنے والوں کو اپنے کسی حسین اور خوش وضع اور خوبصورت محبوب سے ہوتی ہے ، ان کی غزل نظر پڑتی تو اسے دامنِ دل میں چھپاتا ، کبھی ریڈیو پر ان کی آواز سنائی دیتی تو لپک کر اور دوڑ کر سنتا ، وہ خود کہیں ملتے تو ان کے پاس سے جانے اور اٹھنے کو دل نہیں چاہتا ، ان کا خط آتا تو ہفتوں اسے بار بار پڑھتا رہتا ۔"

(یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ ص ۸۰)

شاہ صاحب کے اس اقتباس سے جگر صاحب اپنی پوری آن بان اور شاعرانہ عظمت و رفعت کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتے ہیں ، جیسا کہ میں نے اوپر کہیں عرض کیا ہے کہ یہی ان کی سوانح نگاری کا وصف تھا ۔

مجھے اس بات کا بیحد قلق ہے اور تاسف بھی کہ میں دیوبند میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے باوجود ان سے بہت کم مل سکا ہوں جبکہ ان کے برادر خورد ملک کے مشہور خطیب مولانا سید انظر شاہ صاحب (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) سے دیوبند میں موجودگی کی صورت میں روز از رات گئے تک استفادہ کا موقع میسر رہا ہے ، اور یہ سلسلہ اب بھی باقی ہے ، لیکن جب کبھی بھی ان سے ملا ایسا محسوس ہوا کہ وہ میرے اپنے ہیں ، سراپا شفقت و محبت

اور مجسم عجز و انکسار۔

ایک بار مرحوم نے ماہنامہ" دارالعلوم" دیوبند میں غالباً نومبر یا دسمبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں میرے تعلق سے ایک مختصر سا مضمون شائع کیا ضمناً جماعت اسلامی کو بھی ہدف بنایا، اس مضمون کا دیوبند میں خاصا ذکر رہا کچھ کو مستثنیٰ کر کے بالعموم لوگوں نے اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، ان میں بعض وہ لوگ بھی تھے جو مجھ سے شدید قسم کا جماعتی اختلاف رکھتے ہیں، مجھے اپنی رسوائی کا تو کوئی خیال نہ تھا البتہ جماعتِ اسلامی کی ہوا خیزی سے دل سخت ملول تھا۔

ایک بار ایک مہمان کو دارالعلوم دیکھنے کا شوق ہوا، دارالعلوم کی سیر کرانے کے بعد سوچا کہ شاہ صاحب سے ملاقات کرادوں، دولت خانہ پر گیا، دستک دی، اندر ہی سے آواز آئی، کون صاحب ہیں؟ عرض کیا تابش، فوراً باہر تشریف لائے بڑے تپاک سے ملے، اوپر والی بیٹھک میں لے گئے، نہایت شفقت و محبت کے ساتھ بٹھایا، خیریت پوچھی، میں نے مہمان موصوف کا تعارف کرایا، خود ہی فرمانے لگے میاں! مجھے .... نے خبر دی تھی اسی بنیاد پر میں نے مضمون لکھ دیا تھا، بعد میں تحقیق ہوئی کہ وہ تمہارے سخت بدخواہوں میں سے ہیں اور یہ سب باتیں ان کی خود کی تصنیف کردہ ہیں بیحد افسوس ہوا میں اس سلسلے میں خود تم سے ملنا چاہتا تھا" بھائی صاحب معاف کردو"۔ میں نے عرض کیا شاہ صاحب میں نے اسی وقت معاف کر دیا تھا جس وقت شمارہ میرے مطالعہ میں آیا تھا، بہت خوش ہوئے، کافی دیر تک تحسین آمیز دعاؤں سے نوازتے رہے، پھر سننے سنانے کا دور چل پڑا، میرا یہ شعر سنکر پھڑک اٹھے ؎

شہر والوں نے حقارت سے جسے ٹھکرا دیا ٭ اک وہی مومن تھا سارے کافروں کے شہر میں

اور جب یہ دو شعر پڑھے تو جھوم جھوم اٹھے ؎

داد کے قابل ہے میرا حوصلہ اے دوستو ٭ لے کے مشعل پھر رہا ہوں آندھیوں کے شہر میں

لے کے پتھر آگیا سارا زمانہ میری سمت ٭ نام جب تیرا لیا میں نے بتوں کے شہر میں

اور جب میں نے یہ شعر پڑھا ؎

اب اچھالی جارہی ہیں واعظوں کی پگڑیاں ٭ جہل بھی ہے پانی پانی عالموں کے شہر میں

تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، ان دنوں قضیۂ دارالعلوم شباب پر تھا، علماء و اساتذہ

حدیث کی خانگی زندگیوں کو منظرِ عام پر لایا جا رہا تھا، سب تو سب "حکیم الاسلام" اور "فخر الاماثل" کے لقب سے یاد کیے جانے والے اپنے عہد کے معتبر ترین عالم دین، نمونۂ اسلاف اور بے ریا بزرگ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی بھی پگڑی محفوظ نہ رہ سکی، نہ پوچھئے کیسے کیسے الزامات ان پر تراشے گئے۔ شاید حفیظ میرٹھی نے اسی موقع کے لئے کہا تھا کہ ؎ معصوموں پر آئے ہیں ؛ کیسے کیسے الزامات

آپ یقین کیجئے کہ حضرت قاری محمد طیب صاحب کے خلاف جب میں نے کوئی پوسٹر یا کتابچہ دیکھا یا تقریر سنی تو میرے دوست طاہر تلہری کا یہ شعر مجھے ضرور یاد آیا کہ ؎

فرشتے کھائیں قسم جس کی پاکبازی کی ؛ وہ تیرے شہر میں رسوا دکھائی دیتا ہے۔

غالباً میرے اس شعر پر شاہ صاحب کے سامنے بھی یہی سب مناظر آ گئے ہوں گے اور ان کا حساس و دردمند دل تڑپ اٹھا ہوگا۔

پوری غزل سننے کے بعد فرمایا یہ غزل لکھ کر دیدینا نسیم میاں اشاعتِ حق میں شائع کرادیں گے اس کے بعد ہم لوگوں نے چائے پی اور رخصت ہو گئے، اکتوبر ۱۹۸۵ء کی کسی تاریخ کو مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی کی مجلس میں تشریف لائے ایک نوجوان ان کو سہارا دیئے ہوئے تھے، حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمی مولانا محمد حسین صاحب بہاری بھی ہمراہ تھے بیٹھا نہیں گیا تو وہیں مجلس میں ہی لیٹ گئے، ایک ایک کر کے سب سے خیریت پوچھی، یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

میں پاکستان گیا ہوا تھا ایک روز معروف اسلامی ادیب و سیرت نگار جناب نعیم صدیقی نے اطلاع دی کہ انھیں کسی اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم کے سابق ایڈیٹر جناب ازہر شاہ قیصر انتقال فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون اور کچھ دیر تک سوچ کی وادی میں بھٹکتا رہا، ان کی ایک ایک ملاقات اور اس ملاقات کی ایک ایک بات صفحۂ ذہن پر ابھرنے لگی اور پھر زبان پر بیساختہ یہ شعر آ گیا کہ ؎

کل تو کہتے تھے کہ ہم بستر سے اٹھ سکتے نہیں
آج دنیا سے چلے جانے کی طاقت آ گئی

کہنے کو "فقیر بادشاہ" کی ترکیب عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر اس ترکیب کی ساخت سے زیادہ اس کی معنویت پر غور کیا جائے تو اس کی صحت و صداقت اپنے آپ کو منوائے بغیر نہ رہے گی۔

یہاں جس "فقیر بادشاہ" اور "قلندر صحافی" کا ذکر ہے وہ روایتی بادشاہ کی کہانی ہے نہ روایتی قلندر کی، آج کی صحبت میں جس فقیر بادشاہ اور قلندر صحافی کی بات چھڑی ہے وہ اسی بیسویں صدی کی ایک حقیقی شخصیت تھی، جو ایک سیّد زادے کے روپ میں نمودار ہوئی، جسے ایک یگانۂ روزگار باپ، حوصلہ منداں کے فرزند اور وادیٔ کشمیر کی سعودی شاخ کے ایک نونہال کی حیثیت سے دنیا نے جانا جو سیّد ازہر شاہ قیصر کے نام سے معروف ہے اور فقیر بادشاہ اور قلندر صحافی کے عنوان سے آج کی گفتگو کا موضوع ہے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مرجع انام اور محقق علامہ کو باپ سے استفادہ کا بیٹے کو وقت نہ مل سکا ابھی بچپن نے شعور کی آنکھ کھولی تھی کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا، تاہم ماہتابِ علم باپ کے گرد ہالے کی طرح موجود فاضل تلامذہ نے اپنی حد تک بہت جتن کئے کہ عظیم عبقری باپ کے فرزندِ اکبر کو ان علوم و فنون کا رمز آشنا کر سکیں جو علامہ انور شاہ کا حقیقی ورثہ تھے مگر قدرت نے اس معنوی وراثت کی تقسیم کا کوئی ضابطہ تجویز نہیں کیا جس کے تحت نسلی جانشین کو فکری و علمی وراثت

بھی لازماً منتقل ہوسکے۔

اس صورتِ حال کے اسباب میں ایک طبعی سبب یہ بھی تھا کہ حضرت علامہ انور شاہ کا انتقال ۱۳۵۲ھ میں ہوا جس میں ان کے یہ فرزند اکبر پوری طرح سن بلوغ کو بھی نہ پہونچ سکے تھے۔ اس قلندر صحافی نے ۱۴۰۶ھ میں راہِ آخرت اختیار کیا اور یتیمی کا داغ ۱۴ اور ۱۵ برس میں لگ گیا تھا۔

بلاشبہ ۱۴ اور ۱۵ برس کی عمر تحصیلِ علم کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کی جاسکتی تاہم حضرت علامہؒ زندگی کے آخری سالوں میں جس انقلاب اور تحولِ احوال اور تغیر و تبدل مکان سے دوچار ہوئے اس کی بنا پر اس فرزند عزیز کی بنیادی تعلیم کا کوئی مضبوط نظم نہ بن سکا اور نہ کوئی مستقل تعلیمی رخ متعین ہوسکا جو آگے چل کر ذہن و فکر کے ارتقاء کو ان علمی خطوط پر استوار کرسکتا جو استاذ العلماء علامہ انور شاہ کے عبقری ذہن کا عکسِ جمیل کہے جاسکتے۔

سید ازہر شاہ قیصر کے لئے دینی اور علمی خانوادوں کی روایت کے مطابق تعلیم قرآن کا اہتمام کیا گیا، اس کے لئے مخصوص اساتذہ رکھے گئے بالآخر حفظ قرآن کی تکمیل کی، چونکہ قرآن کریم کا حفظ بہت توجہ اور وقت چاہتا ہے اس لئے ابتدائی عمر کا خاصہ حصہ تو اس کی نذر ہوگیا، حفظ قرآن کے بعد اردو فارسی وغیرہ کی ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ ہوئی، طبیعت ذہین و فطین اور مزاج سیماب وش پایا تھا، پھر صاحبزادگیت کی جملہ علامتوں اور احساسات کے ساتھ کسی نظم و ضبط کی پابندی اور کسی استاد کی تادیب گوارا کرنے میں جو نفسیاتی اور طبعی دشواریاں پیش آسکتی ہیں ان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، لیکن کسی باقاعدہ اور مستقل تعلیمی نظم سے منسلک نہ ہونے کے باوجود اردو فارسی کی پختہ استعداد عربی زبان سے مکمل آگاہی، علمی و فنی اصطلاحات سے واقفیت جس طرح انھوں نے بہم پہونچائی وہ ان کی ذکاوت و ذہانت اور فطانت کی واضح پہچان ہے، انھوں نے اپنے شغف و آگاہی اور ذوق علمی کے تحت کسی درسگاہ سے وابستگی کے بغیر اس طرح تیار کیا، اپنے فکر و ذہن کو آراستہ کیا وہ ایک عظیم باپ کے فرزند ہی کا سلسلہ تھا انھوں نے اپنی اسی نو عمری میں کہیں باضابطہ داخلہ لئے بغیر اپنے کو ذہنی طور پر اس حد تک تیار کرلیا تھا جو کسی اگلے تعلیمی مرحلے اور تدریسی منزل سے گذرنے کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔

جس فضا میں ان کے شعور نے آنکھ کھولی تھی اس میں باپ کی عظمت کے ڈنکے بج رہے تھے، ان کا سکہ علم کی مسندوں، مدرسوں کی صحنوں اور جرائد کے کالموں میں چل رہا تھا علامہ انور شاہؒ

کی قدر و قیمت کا احساس ملت اپنے دستور کے مطابق ان کے وصال کے بعد کر رہی تھی، اب انجمنوں میں ان کا ذکر تھا، مجلسوں میں ان کا چرچا تھا اور اہل علم کی زبانوں پر انہی کی بات تھی، پورے برصغیر میں محسوس کیا جا رہا تھا کہ علامہ انور شاہ کا انتقال نہیں ہوا چودہویں صدی کے غزالی و ابن تیمیہ نے دنیا سے کوچ کیا ہے۔ اقبالؔ ان کی جدائی پر مغموم، سید سلیمان ان کے ماتم گسار، حکیم الامت حضرت تھانویؒ متاسف، دیوبند اپنے لعل بدخشاں کا نوحہ گر اور ملت ان کی مرثیہ خواں تھی۔

سید ازہر شاہ نے چاروں طرف باپ کی عظمت کا غلغلہ دیکھا اور ہر طرف ان کی مدح شناسی تو ایسے حالات میں صاحبزادگیت کے جملہ آثار و احوال ان پر طاری نہ ہوتے تو اور کیا ہوتا، پھر طرفہ تماشہ یہ کہ حضرت علامہ انور شاہ کے منتسبین و معتقدین نے علامہ کی وفات کے بعد ان کے اہل خانہ اور اخلاف کی حقوق شناسی اور قدر شناسی کا اس حد تک مظاہرہ کیا کہ اس نے ازہر شاہ کی طبیعت میں آزادگی، بے نیازی اور خود رائی کا عنصر پیدا کر دیا جس کی بنا پر وہ باپ کے بلند و بالا آستانۂ علم کے بعد کسی اور علمی چوکھٹ پر جبہ سائی کے لئے خود کو آمادہ نہ کر سکے، حالانکہ علم اپنے اندر متضاد صفات رکھتا ہے، جب تک علم کی طلب میں آدمی خود کو پوری طرح اس کے سپرد نہ کر دے وہ انتہائی بخیل واقع ہوا ہے، اور جب انسان اپنے کو یکسر اس کی نذر کر دے تو علم اپنے خزانوں کے در کھول دیتا ہے۔

اسی صورت حال نے سید ازہر شاہ کو اس علمی تربیت و نگہداشت سے مستفید نہ ہونے دیا جو ایک علمی خانوادے کے افراد کی فکری تربیت کمالِ علمی کے حصول کیلئے ضروری ہے۔

اس عجیب و غریب گرد و پیش سے دوچار ہونے پر سید ازہر شاہ کو جو کچھ علمی طور پر حاصل ہوا وہ ان کے ذاتی مطالعہ کا ثمرہ تھا، انھوں نے اپنے گرد و پیش جنگ آزادی کا بگل بجتے ہوئے دیکھا، اردو زبان کے جواں سال ادیبوں کو استبدادِ فرنگ کے خلاف جد و جہد کے میدان میں رجز خوانی کرتے سنا، حلقۂ دیوبند کے حریت پسند رہنما، علماء کی انقلابی تقریریں سنیں، مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر جلال خطابت، اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی جادو بیانی کو انھوں نے دیکھا، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی شیر کی طرح دھاڑتی آواز فضا میں گونجتی سنائی دی، مولانا حفظ الرحمٰن کی طوفان کی طرح امنڈتی گرجتی برستی تقریریں ان کے سامنے تھیں۔

ادھر صحافت کے پیشوائے اعظم ظفر علی خاں، مایۂ ناز صحافی و اہل قلم مہر و سالک، ممتاز ادیب تاجور نجیب آبادی اور مقبول شاعر احسان دانش کی صحبتیں اٹھائیں۔

زبان و ادب سے انھیں شروع سے ہی لگاؤ تھا پھر ابتدائی صحبتیں ان صحافیوں اور قلمکاروں کی نصیب ہوئیں جو اردو زبان کے شہسوار اور میدانِ صحافت کے راہنما تھے، ان کی ہم نشینی اور رفاقت نے ان کی وہ خفیہ صلاحیتیں اس طرح بیدار کیں کہ آگے چل کر وہ صاحب طرز انشاپردازوں اور قلم کاروں کی صف میں شامل ہو گئے۔ ان کا پہلا مضمون اپنے وقت کے مایۂ ناز اخبار "زمیندار" میں شائع ہوا تھا جو بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کی ادارت میں نکلنے والا معرکۃ الآرا اخبار تھا۔

ایک نو آموز لکھنے والے کے پہلے ہی مضمون کو ایک ایسے معیاری اخبار میں اشاعت کے لئے قبول کر لیا جانا گویا اس بات کی سند تھی کہ صاحبِ مضمون کس شاندار صحافتی مستقبل کا مالک ہے اور جس کے قلم میں فکر و فن کا وہ جوہر پنہاں ہے جو اردو زبان و ادب میں ایک قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ازہر شاہ صاحب کی ذہانت و فطانت فطری صلاحیت و ذاتی قابلیت نے انھیں اپنی خوردی و کم سنی کے دور ہی میں ان بڑوں کا ہم نشین اور مجلسی بنا دیا جن کی نگاہ جوہر شناس اور صحبت شخصیت ساز تھی وہ بے باکانہ دوراں وقت کے نامور لوگوں، مسلم خطیبوں، ممتاز مقتداؤں اور باعظمت عالمین، صاحبِ فن ادیبوں اور مقتدر شاعروں، عظیم صحافیوں اور باکمال قلم کاروں کے درمیان بیٹھتے، ان کی باتیں سنتے، ان سے استفادہ کرتے اور اسی سے اپنے ذہن کے علمی و فکری سرمایہ میں اضافہ کرتے۔ جب کہ سید ازہر شاہ کی خداداد صلاحیتوں کے پروان چڑھانے میں تلمذ و اکتساب کو کوئی دخل نہیں رہا جس کی تائید اخبار صداقت سہارنپور کے اس خاص نمبر سے ہوتی ہے جس نے نوخیز نوجوان سید ازہر شاہ قیصر کے منتخب مضامین پر مشتمل ایک شمارہ شائع کیا تھا جس پر ۲۴؍ فروری ۱۹۳۹ء درج ہے۔ اس کا اداریہ علامہ انور صابری نے لکھا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں :۔

"خدائے بزرگ و برتر کا احسان ہے کہ قیصر قیودِ اکتساب سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر پروان چڑھے اور آج ان کی قوتِ قلم اپنوں سے گذر کر بیگانوں سے بھی خراجِ تحسین

وصول کر رہی ہے۔ وہ ادیب ہیں اور بلند پایہ ادیب، وہ نثر نگار ہیں اور ہونہار نثر نگار آج ان کی تحریریں ادب آموز، ان کا اندازِ نگارش درس آفریں، یوں تو انشا پردازی کی ہر صنف پر جناب قیصر کو قدرت ہے، قیصر سنجیدہ، متین اور لطیف و معنی خیز مزاحیہ نگاری کا بھی ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں، لیکن قیصر کا زورِ قلم اسلامی عنوانات پر جو بہار آفرینیاں کرتا ہے خود قیصر کی پوری مضمون نگاری میں اس کا جواب نہیں۔"

جناب قیصر کی قوتِ انشاء سلیقۂ تحریر اور قدرتِ بیان کا اعتراف کرنے کے بعد علامہ انور صابری اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ۔

"قیصر ابھی زندگی کے ابتدائی دور میں ہیں مگر ان کی پختگیٔ نگارش پیرانہ سالی کی آئینہ دار ہے، قیصر آج نوعمری کے باوجود کہنہ مشق انشاء پردازوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔"

یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ صحافی اخبار صداقت کے مستقل مضمون نگار تھے، اور ان کے مضامین کی ندرت و دلکشی قارئینِ صداقت کے لذت کام و دہن کے لئے لازمی ہو گئی تھی۔

اس سے قبل ۱۹۳۷ء میں مبلغ نے ۱۵ دسمبر کے شمارہ میں سید ازہر شاہ قیصر کے مختصر مضمون "عمر فاروق دائرہ اسلام میں" شائع ہو رہا تھا، اس میں ان کا اندازِ تحریر کس قدر طویل جملوں اور بھاری بھرکم ترکیبوں پر مشتمل ہے، مثلاً

"نبی الانبیاء ظلمت کدۂ شرک و کفر کو نیرِ اسلام کے انوار سے منور کرنے کے لئے طاغوتی ابتداد اور کفر و شرک کی عزائم شکن ستم آرائیوں سے بے پرواہ ہو کر شراب وحدانیت کے مسحور کن جرعے پیتے ہوئے بلند آہنگی کے ساتھ

وہ جس نے ایک حرف کن سے پیدا کر دیا عالم ۔ کشائش کی صدائے ہائے ہو سے بھر دیا عالم

کا حشر خیز نعرہ لگا رہے تھے۔"

دو سال بعد سید ازہر شاہ قیصر اجتماع لاہور کے یکم نومبر ۱۹۳۷ء کے شمارہ میں "طوفانِ نوح" کے عنوان سے مختصر جملوں اور چست ترکیبوں سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"حضرتِ نوحؑ اس قوم سے تنگ آ گئے اور ان کے دل سے نکلی ہوئی صدائے حق اس قوم کے کسی فرد پر اثر کئے بغیر فضا میں گونج کر رہ گئی تو انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔"

اسی کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں استقلال دیوبند کے ۴ و ۱۲ فروری کے شمارہ میں تواضعات کے کالم میں مولانا ظفر علی خانؒ کی صحافتی روش پر تبصرہ کا انداز کس قدر شائستہ رواں دواں اور اثر انگیز ہے۔

"ہمارے دل میں مولانا کی بہت عزت ہے، ان کی جرأت مسلّم، ان کے زورِ قلم کے ہم معترف ان کی نظموں کی تعریف میں ہم رطب اللسان، ان کے اخلاص سے ہمیں انکار نہیں، مگر مولانا کی لیڈری کے ہم قائل تھے اور نہ آئندہ ہوں گے۔ اس لئے کہ لیڈری بھک سے اڑجانے والی اس بارود کا نام نہیں بلکہ سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح ایک جگہ کھڑے ہونے والے انسانوں کو کہا جاتا ہے۔ فوج کا جرنل۔"

پھر کچھ عرصہ بعد ۱۹۴۰ء میں جب والد بزرگوار علامہ نورشاہ کشمیری کی یادگار کے طور پر پندرہ روزہ "النور" کا اجراء کیا تو اسکے یکم نومبر کے شمارہ میں جو پہلا ہی شمارہ تھا لکھتے ہیں۔

"سچ یہ ہے کہ ظاہری اسباب کی حیثیت سے ہم بہت تنگدست ہیں۔ ہمارے پاس قلم ہے لیکن وہ بھی خریداروں سے چندہ وصول کرنے کے لئے لمبی لمبی اپیلیں لکھنے سے عاجز، دماغ ہے تو وہ بھی خوشامد اور بیجا تملّق کے کسی ادنیٰ تصور سے قطعی طور پر پاک دیوبند ایک چھوٹا سا شہر اور عمرانی ترقیوں سے محروم ہے، اخباری سلسلے میں کتابت و طباعت کی جو سہولتیں درکار ہوتی ہیں وہ یہاں بالکل مفقود ہیں، ان ناسازگار مشکلات میں ہماری ابتدائی خام کارانہ غلطیوں کے ازالہ اور بلند ارادوں اور تمناؤں کی تکمیل کا تمامتر انحصار! اس حاکم و یکتا و بے ہمتا کے لطف و کرم پر ہے جس نے ہماری ابتدائی دقتوں کو حل فرمایا ہے، سچائی و صداقت اور اخلاص و نیک نیتی اگر دنیا میں کسی شئی کا نام ہے اس کا دامن تھامتے ہوئے اپنے پروردگار سے عرض گذار ہیں کہ وہ اپنے دین کے ان چند جواں ہمت نوجوانوں کو خدمتِ اسلام اور احیاء دین متین کی توفیق عطا فرمائے، الٰہی تو ہمارے ہر جلی و خفی راز کا عالم ہے تو بہتر جانتا ہے کہ یہ چند نوجوان اس پرچہ کی آڑ لیکر اپنے لئے نان و نفقہ مہیا نہیں کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ان کی تمنا صرف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مخدوم و مرشد فخر المحدثین حضرت العلام سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں جو پودا لگایا ہے وہ پھلے پھولے اور ایک سایہ دار درخت کی شکل اختیار کرے۔"

اخبار "صداقت" ۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۶ء میں "اسرار و لطائف" کے تحت مولانا محمد علی کے بارہ میں کتنی سلاست و بے ساختگی اور معجز بیانی کے ساتھ لکھتے ہیں۔

" ہائے اسلام کے یہ اولوالعزم فرزند، ملّت کے یہ سرفروش مجاہد، ایمان کے یہ مخلص داعی، قوم کے یہ بے لوث خادم، اللہ اور اللہ کے رسول کے یہ جاں نثار فدائی، تہ خاک مدفون، قدرت تیرا قانون، مالکِ دو عالم تیری منشا اور کارسازِ عالم تیری مرضی۔

ان کی بے تکلفی اور سادہ مزاجی اور آرائش سے بے نیاز زندگی کی شہادت ان کے ہر وقت کے ہم نشستوں کے بیان سے ملتی ہے۔ ماہنامہ طیب کے شاہ نمبر میں مولانا اسلم صاحب لکھتے ہیں۔

" مگر شاہ صاحب کے وہ سب اصول و نظریات صرف تقریر و بیان کے لئے ہوتے تھے خود اپنی زندگی کو انھوں نے اصول و قواعد کے گورکھ دھندوں سے ہمیشہ آزاد رکھا۔ نہ کھانے پینے میں اصول نہ پہننے اوڑھنے میں نفاست کا اہتمام، نہ سونے جاگنے میں انضباط اور نہ لکھنے پڑھنے کے لئے اوقات کا تعین، لباس کے معاملے میں اپنے سراپا سے بے نیاز رہتے تھے، پھٹا ہوا یا بے جوڑ پیوند لگا ہوا جیسا کپڑا ہاتھ لگا پہن لیا، دیکھنے والوں کے تبصرے سے ہمیشہ بے پرواہ رہے، کھانے پینے میں شاہ صاحب کا کوئی نفیس مذاق نہیں تھا نہ وقت کی قید تھی، کبھی رات کا کھانا عصر کے وقت کھا لیتے اور کبھی دوپہر کا کھانا صبح ناشتے کیساتھ ادا ہو جایا کرتا جو کچھ اور جس وقت سامنے ہوتا نہایت رغبت سے کھایا کرتے۔

لاپروائی اور لاابالی پن وہ اپنے طرز ادا سے ظاہر کرتے مگر حقیقۃً وہ اپنے سینے میں ایک حساس اور دردمند دل رکھتے تھے اور اپنے حلقۂ احباب میں سے کسی کی تکلیف و پریشانی سے بے چین ہو اٹھتے تھے اور ممکن حد تک اس کی چارہ گری کیا کرتے، بڑے سے بڑا حادثہ پر ان کی سطح پُرسکون نظر آتی اور ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھیلتی ہوتی، لیکن جب کبھی اطمینان سے بات کرنے کا موقعہ ملتا تو ان کے دل کا درد لفظوں میں ڈھل کر ان کے ہونٹوں پہ آجاتا اور وہ ایک بالکل بدلی ہوئی شخصیت کے روپ میں نظر آتے۔"

قلندرِ صحافی اور فقیرِ بادشاہ کی ترکیب مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں سیدازہر شاہ قیصر کے لئے یقیناً غیر موزوں نہیں سمجھی جائے گی۔

دیوبند نے جب علمی انگڑائی لی اور اس انگڑائی سے دارالعلوم وجود پذیر ہوا تو پھر اس کی آغوش سے درجنوں رسائل و جرائد نے بتدریج وقفے وقفے سے جنم لیا اور دیوبند ایک طرح سے دارالعلوم کی چار دیواروں کے باہر علمی، دینی، ادبی صحافت کا مرکز بن گیا۔ القاسم، الرشید، ہادی، خالد، تجلی، نقش مشرب، مرکز، اسلامی دنیا، ایمان، توحید، یثرب، مہاجر، استقلال جیسے رسائل و جرائد نے اپنا ایک مقام پیدا کیا، "دارالعلوم" جو دارالعلوم دیوبند کا علمی و صحافتی ترجمان تھا منظر عام پر آیا تو سید ازہر شاہ قیصر نے اس کی ادارت سنبھالی اور دارالعلوم کو حتی الامکان ایک وقیع اور مقبول پرچہ بنانے اور پابندیٔ وقت کے ساتھ اس کو شائع کرنے میں ایک ریکارڈ قائم کر دیا، یوں تو سید ازہر شاہ قیصر نے بیشمار جرائد کی کالم نویسی میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا، لیکن خداداد صلاحیتوں نے صحافت کی دنیا میں اپنی ایک الگ اور ممتاز حیثیت بخشی، انھوں نے بات کہنے کا ایک نیا آہنگ اور نیا لب و لہجہ اپنایا، ان کی انشا پردازی دوسروں سے بالکل مختلف تھی، غور کیجئے تو وہ صحافت کے میدان میں صاحبِ طرز انشا پرداز تھے، ان کی انشا بظاہر تو دوسروں سے جدا اور الگ معلوم نہیں ہوتی تھی، مگر اس کی روانی، سلاست، رسیلا پن، بے باکی اور حقیقت بیانی ایسی پرتاثیر ہوتی تھی کہ کسی موضوع پر ان کے خیالات اور نقطۂ نظر پڑھنے کے بعد قاری ان کے ساتھ ساتھ ہو جاتا تھا، کسی اہل قلم کی نگارش کا سب سے بڑا حاصل یہی ہے کہ اس کو تسلیم کیا جائے اور وہ ذہن و دماغ کو بے ساختہ متاثر کرے۔ اس کمال فن کے ساتھ اس فقیر بادشاہ اور قلندر صحافی نے دارالعلوم دیوبند سے وابستگی اختیار کر کے اپنی زندگی کے آخری ۲۵ سال اس طرح گذار دیئے کہ انھوں نے اپنے فکر و ذہن کی بلند پروازیوں اور طبیعت کی سرجوشیوں کو دیوبند کی مخصوص حد بندیوں کے تابع کر دیا اور نسبتِ انوری کے اہتمام میں قلم کی جولانیوں اور ذہن کی پرکاریوں کو بے قابو نہ ہونے دیا، افسوس اس پایہ کا صحافی اور اس مزاج کا اہل قلم گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کی نذر ہو گیا وہ جن ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک اور جن مختلف النوع اہلیتوں کے وہ حامل تھے ان کا تقاضا تھا کہ ملی حلقے ان کی زیادہ سے زیادہ پذیرائی کرتے اور وطنی دائروں میں ان کی قدر و منزلت ہوتی مگر قلندر صحافی اور فقیر بادشاہ نے کبھی زمانہ کی اس ناقدری اور وقت کی اس بے رخی کا شکوہ نہیں کیا اور جس شانِ استغنار سے انھوں نے ساری زندگی گذار دی اسی بے نیازی سے دنیا کو الوداع کہا۔

رئیس القلم

وہ قافلے کو راہ دکھا کر چلا گیا
تاریکیوں میں شمع جلا کر چلا گیا
آیا وہ اس طرح سے کہ آ کر چلا گیا
محفل میں اپنا رنگ جما کر چلا گیا
وہ شعر گو، ادیب، صحافی، نثر نگار
ہر رنگ و بو کے پھول کھلا کر چلا گیا
تعمیر کر گیا وہ محبت کا اک محل
دیوار نفرتوں کی گرا کر چلا گیا
اوروں کے غم سمیٹ کے دامن میں بھر لئے
خوشیاں وہ دوسروں کو لٹا کر چلا گیا
کہتے ہیں جس کو لوگ "رئیس القلم" نواز
اپنے قلم کی جوت جگا کر چلا گیا
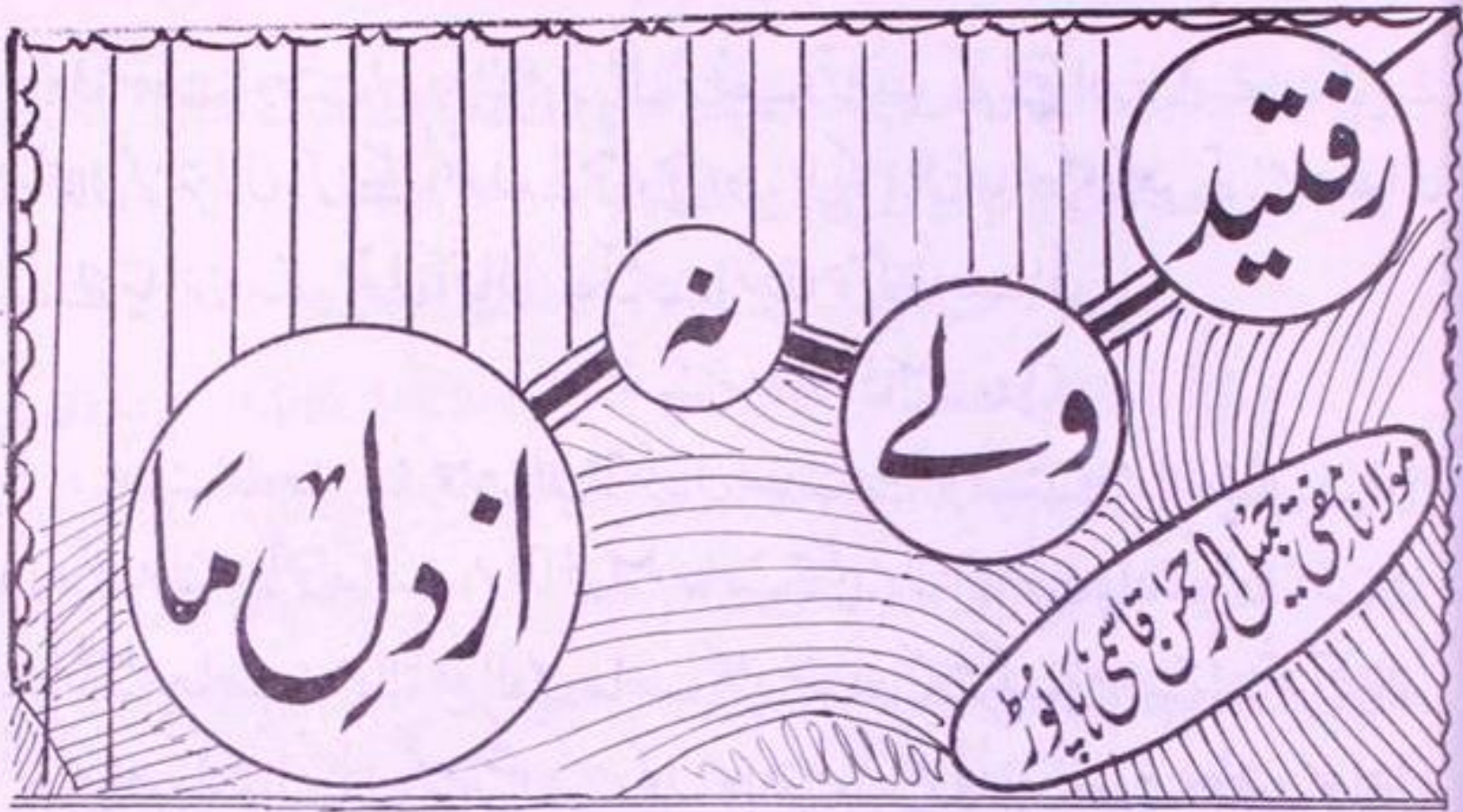
حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی پُر بہار شخصیت سے کون واقف نہیں علم وحکمت، فکر وتدبر، ادب وصحافت، نثر ونظم ہر فن میں یکتائے روزگار تھے، نسبت اتنی قوی اور اعلیٰ کہ برصغیر اور ایشیا وافریقہ اور بلادِ یورپ کے تمام اربابِ علم وفضل اس مقدس خانوادے کے بالواسطہ یا بلا واسطہ مرہون منت ہیں، متکلم اسلام، علامۂ دہر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر فرزند ہونے کے ساتھ ________ ان کے اخلاق عالیہ کا جیتا جاگتا نشان تھے، ان بلند وبالا کمالات کے ساتھ ظرافت، بذلہ سنجی اور سادگی نے ان کی ذات منظہر صفات کو چار چاند لگا دیئے تھے، جرأت وبے باکی اور صاف گوئی میں اپنی مثال آپ تھے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند کے اصرار پر اپنی تمام علمی، ادبی صلاحیتوں کو دار العلوم کے لئے وقف کر دیا، ماہنامہ دار العلوم کے ۲۴ سال ایڈیٹر رہے اور دار العلوم کے علمی دینی اور تاریخی لٹریچر کو مرتب کرنے میں اپنا گراں قدر تعاون فرماتے رہے رسالہ دار العلوم کو مقبول بنانے میں ان کی کاوشں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مزاج میں استقامت اور وفا شعاری درجۂ کمال کو پہونچی ہوئی تھی مرکز دار العلوم میں کیسے کیسے انقلاب آئے، تیز وتند آندھیاں چلیں، اچھے اچھے صاحب فضل وطریقت جادۂ مستقیم کو چھوڑ کر مصلحت کوشی کو ترجیح دی اور وقت کے چیلنج کا مقابلہ نہ کر سکے مگر حضرت شاہ صاحبؒ

کو کوئی منفعت یا وحشت لرزہ براندام نہ کر سکی، ترغیب و ترہیب کے نسخے اور فارمولے ان کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کر سکے، انھوں نے حق کو حق اور باطل کو باطل کہا اور کسی سمجھوتے یا سودے بازی کے لئے تیار نہ ہوئے، بقول اقبالؒ ؎ آئین جوانمردی حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت شاہ صاحب مرحوم مردانِ حق کی ان صفات سے آراستہ تھے، مولانا سید محبوب رضوی صاحبؒ، مولانا عبدالحق صاحبؒ، مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی، مولانا محمد عثمان صاحبؒ، مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب اور مولانا ظفرالدین صاحب اکثر و بیشتر ان کے شریکِ بزم رہتے اور شعر و سخن اور نکتہ فہمی اور بذلہ سنجی کی محفلیں گرم رہتیں، بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت و عنایت کا ماحول دیکھنے میں آتا، ایک ساعت ارکینِ شوریٰ اور قائدینِ ملک و ملت کے ساتھ بے تکلف، دوسری ساعت ہم عصروں اور دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور تیسری ساعت ہم جیسے خوردوں کے ساتھ تکلف برطرف راہ و رسم، مولانا مرحوم کا امتیازی وصف اور روایات سلف کا جیتا جاگتا انداز بڑا پرکشش معلوم ہوتا ہے

جمع ہیں تجھ میں سب وصف و ہنر اے مجمع خوبی

ملاقاتی ترا گویا بھری محفل سے ملتا ہے

حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو رحلت فرما گئے، ان کی وفات حسرت آیات پر پوری علمی دنیا سوگوار تھی، حضرت شاہ صاحب پر یہ صدمہ برق علی البرق کی حیثیت سے اثر انداز ہوا، ان دنوں میرے نام ایک خط تحریر فرمایا۔

برادر عزیز! السلام علیکم

حد ہو گئی کہ آپ دیوبند آئے اور مجھ سے ملے تک بھی نہیں، کم از کم اتنا ہی ہوتا ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں ٭ تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

حضرت قبلہ (مہتمم صاحب) کا حادثۂ رحلت ہمارے دلوں کا ایک ناسور ہے جو ساری عمر بہتا رہے گا میرا دلی تقاضہ ہے کہ مرحوم کے نام سے رسالہ جاری کروں اور حضرت مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اپنے اخبار "اشاعتِ حق" کا ایک نمبر نکالوں، آپ سے میری استدعا ہے کہ اس وقت اپنے تعاون کو حضرت قبلہ کا ایک حق سمجھیں، اس مظلوم ہستی کے متعلق کوئی چیز تو ایسی آجائے جس سے

اس کی ساٹھ سالہ خدمات کی ایک جھلک دنیا کو دکھائی جا سکے، ہم نے حضرت رہ کے نام پر اور جو قربانیاں دی ہیں یہ ایک معمولی سی قربانی اور سہی۔ والسّلام

سید ازہر شاہ قیصر۔ شاہ منزل محلہ خانقاہ دیوبند

پوری آب و تاب کے ساتھ اشاعتِ حق کا "حکیم الاسلام نمبر" نکالا، اور پھر چند دن کے بعد ہی ماہنامہ "طیّب" جاری کیا، اپنے ہونہار اور قابل فاضل فرزند جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کو اس کا مدیر مسئول بنایا، بحمداللہ دو سال کے قلیل عرصہ میں رسالے نے عوام و خواص کے حلقوں میں مقبولیت تامہ حاصل کی اور حکیم الاسلام رہ کے کلماتِ طیبات، تبلیغ دین، فقہ حنفی، ادبی فیچر اور عصرِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ دیگر مضامین سے رسالہ آراستہ کر کے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ؎ گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاکست

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات سے ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا، ان کے خاندان کو پسماندگان کو علم و ادب اور مہر و وفا کے دیوانوں کو، ایثار پیشہ اور باضمیر انسانوں کو — ایک تاریخ مٹ گئی ایک نسل کا خاتمہ ہو گیا، بقول میر ؎ مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان کا جسدِ خاکی تودۂ خاک میں پنہاں ہو گیا مگر ان کا کردار زندہ ہے، ان کا ایثار اور قابل تقلید مقدس تذکار تابندہ ہے، اس نقشِ تابندہ کا اتباع اور پیروی نئی نسلوں کے حال اور مآل کو بہتر بنانے کی ضمانت ہے ؎ اسی کے نقشِ کفِ پا تلاش کر کے چلو

عروج ہوش کی دنیا تلاش کر کے چلو

رسالہ طیّب کے پہلے ورق پر حضرت شاہ قیصر صاحب کا نقشِ اول جلوہ گر ہوتا تھا حسب معمول ماہ نومبر کے شمارہ میں بھی ان کا مضمون گرامی اسی عنوان سے سامنے آیا، مگر یہ نقشِ اول آخری پیغام ثابت ہوا، شاید یہ سطور لکھتے وقت فرشتۂ اجل نے سرگوشی کی ہو گی کہ یہ سطور آخری سطور ہیں اور یہ نقش آخری نقش ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا لہجہ نہایت پرسوز ہے، درد بھرا انداز ہے، اور ملت اسلامیہ کی تباہ حالی کا منظر نگاہوں کے سامنے ہے، آنسو رواں ہیں اور ان اشکہائے

حقیقت افروز کو خامہ میں لے کر یوں رقم طراز ہیں. مضمون کے آخری حصہ کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں

"نوجوانانِ قوم نے سنا ہوگا ! کہ مسلمان ابتدا میں بہت تھوڑے، کمزور و درماندہ اور ان کی آواز بہت پست تھی، پھر چند ہی دنوں میں انھوں نے صحن عالم سے مذاہب باطلہ کی بساط الٹ کر رکھدی اور شرق و غرب کی آخری حدود تک کفر و شرک کی اندھیریوں میں اسلام کا اجالا کردیا.

سیدنا عمر فاروق رضہ کے متعلق عیسائی مؤرخین تک نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے دورِ خلافت میں مسلمانوں نے چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کر لئے تھے، جن کا اوسط فی قلعہ روزانہ پڑتا ہے. قیصر و کسریٰ کی وہ عظیم الشان سلطنتیں جن کی وسعت و شوکت اور دبدبہ و صولت کا اس چرخ نیلوفری کے نیچے کوئی جواب نہیں تھا، مسلمانوں کے آگے یوں پارہ پارہ ہوکر رہ گئی تھیں جیسے عاشق نامراد کے جیب و آستیں."

حضرت شاہ صاحبؒ یاس و بیم کے اس ماحول میں نوجوان نسل کو امید و بیم کی کرن سمجھتے تھے، ان کو توقع تھی کہ اگر نوجوانانِ ملّت نے خود کو پہچان لیا تو قسمت کا فیصلہ بدل سکتا ہے اور قوم سربلندی حاصل کرسکتی ہے، چنانچہ انھوں نے نوجوانوں کے خوابیدہ ضمیر پر اس طرح دستک دی،

"نوجوان قوم نے کیا اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کی ہے کہ دورِ اوّل میں ہماری کشور کشائی، جہانبانی اور حکمرانی آخر کس چیز کی مرہونِ منت تھی، اور آج کی یہ ذلت و مسکنت اور بے عزتی و بے حرمتی کن گناہوں کی پاداش ہے."

افسوس ہے کہ یہ دردبھری صدا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی، لیکن دردمندانِ قوم اور نوجوانانِ ملّت کے لئے نقشِ دوام چھوڑ گئی اور دعوتِ فکر و عمل پیش کر گئی.

لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ !

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

عادل صدیقی

۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو ادب و صحافت اور اکابرِ دیوبند کی یادگار شخصیت، ابن الانور، رئیس القلم سید محمد ازہر شاہ قیصر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو کر مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ؎ موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ، کل ہماری باری ہے۔

اس المناک خبر نے ادبی اور قلمی دنیا کو ویران کر دیا، ملت اسلامیہ کے ایک جلیل القدر مجاہد، صاحبِ فراست انسان، یادگارِ انور شاہ، ممتاز ادیب و مفکر، صاحبِ طرز انشاپرداز، اس دنیا سے رخصت ہو گیا، یہ روح فرسا خبر سنکر گذشتہ برسوں کی تاریخ کے بہت سے اوراق نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ ذہن ماؤف ہو گیا اور غور و فکر کی قوتیں مضمحل نظر آنے لگیں، ان کی وفات کسی ایک شخص یا کسی ایک ادیب یا مجاہد کی ہی موت نہیں ہے بلکہ یہ مولانا انور شاہ کشمیری رح کے انقلابی فکر، مولانا قاری محمد طیب رح کی دانشوری کی تمثیل، مولانا سید حسین احمد مدنی رح کے عزم راسخ کی تصویر اور اکابرینِ دیوبند کے فکر اور آسمانِ دیوبند کے ماہِ کامل کے کمالات کی کتاب اور باب کا اختتام ہے، ملت کا یہ بیباک مجاہد، جرأت و یقین کی بھرپور قوتوں کے ساتھ قلم کی شیرینی، سلاست روانی، چابکدستی، پختگیٔ فن اور خوبصورتی کی دلکش تحریریں سب کچھ لیکر رخصت ہو گیا۔

آپ یگانۂ عصر، محدثِ کبیر، فاضلِ اجل مجددِ وقت مولانا انور شاہ کشمیری رح کے بڑے لڑکے تھے، وہی مولانا سید انور شاہ کشمیری جو خودداری اور اوصافِ حسنہ کا مکمل نمونہ تھے، اپنے علمی کمالات و امتیازات کے اعتبار سے آپ نے جو مقام حاصل کیا اور بالخصوص حدیث اور رجالِ حدیث پر جو

گہری نظر ڈالی اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی، بقولِ اقبال ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔

ابو داؤد کی شرح انوار المحمود آپ ہی کے افادات کا مجموعہ ہے۔

مشہور صحافی ۱۹۳۳ء میں جب مولانا سید انور شاہ کشمیری رح کی تعزیت کے لئے مولانا ظفر علی خاں دیوبند تشریف لائے تھے تو سید محمد ازہر شاہ قیصر نے آپ کے اعزاز میں ایک سپاسنامہ لکھا اور جامع مسجد دیوبند کے جلسے میں مولانا کو پیش کیا، مولانا ظفر علی خاں نے اس پر اظہار مسرت فرمایا اور اس سپاسنامہ کو روزنامہ "زمیندار" کے پہلے صفحے پر شائع کیا۔

۱۹۳۶ء میں انھوں نے سہارنپور سے "صداقت" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جو کئی برس تک نہایت کامیابی کے ساتھ جاری رہا، اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی، ۱۹۴۱ء میں دیوبند سے ہفتہ وار اخبار "انور" جاری کیا، یہ بھی کئی سال تک کامیابی سے جاری رہا۔ ۱۹۴۳ء میں آپ لاہور چلے گئے جہاں ۱۹۴۵ء تک آپ کا قیام رہا، لاہور میں مولانا ظفر علی خاں، عبد المجید سالک، غلام رسول مہر، مرتضیٰ احمد خاں میکش، چراغ حسن حسرت جیسے مشہور ومعروف ادیبوں اور صحیفہ نگاروں کا ساتھ رہا، اس زمانے میں مشہور زمانہ اخبار "زمیندار" روزنامہ "احسان" اور "انقلاب" وغیرہ میں ان کے مضامین نمایاں طور پر شائع ہوتے رہے، ایک اندازے کے مطابق انھوں نے اپنی مدت العمر میں تقریباً ساڑھے چار ہزار مضامین مختلف ادبی، دینی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھے، تقریباً ۲۲ برس دار العلوم دیوبند کے ماہنامہ "دار العلوم" کے ایڈیٹر رہے، ان کا زمانۂ ادارت اس ماہنامہ کی زندگی کا زریں دور سمجھا جاتا ہے، وہ ایک بالغ نظر صحافی اور نہایت ذکی اور ذہین قلمکار رہے ہیں، دیوبند سے شائع ہونے والے اخبار "استقلال" ماہنامہ "ہادی" ماہنامہ "خالد" کے بھی ایڈیٹر رہے، اس طرح انھوں نے سات یا آٹھ مختلف رسائل اور اخبارات کی ادارت سنبھالی۔ ان کے مضامین ہندوستان اور پاکستان کے تمام معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

تصانیف:۔ انھوں نے "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" کے عنوان سے جو کتاب لکھی

اس میں علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا حفظ الرحمنؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمنؒ کے علاوہ جگر مراد آبادی کی شاعری، احسان دانش، مولانا ظفر علی خاں، مولانا غلام رسول مہر، مولانا مظہر علی اظہر وغیرہ سے متعلق مضامین شامل ہیں جن میں نہ صرف ان سے اپنی رفاقت کا ذکر ہے بلکہ دماغی اور باطنی صلاحیتوں کے بہت سے انمٹ نقوش کا بھی تفصیلی بیان ہے، ایڈیٹر دیوبند ٹائمز مولانا شاہین جمالی نے کتاب کے پیش لفظ میں لکھا کہ "شاہ صاحب کے نکتہ رس اور فن شناس قلم نے بیتے لمحوں اور ماضی کی بھولی بسری مگر ناقابل فراموش شخصیتوں کا عکس فن کے شیشے میں اس طرح اتار لیا کہ بقول جگر مرحوم ؎

وہ کب کے آئے اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں یہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

ان کی ایک اور بیش قیمت تصنیف "سفینۂ وطن کے ناخدا" کے نام سے ہے، یہ ایک تاریخی یادداشت اور مجاہدینِ جنگ آزادی کی ناقابل فراموش داستان ہے، یہ ایسے جلیل القدر بزرگوں کا ذکر خیر ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے جوہری کردار سے ملک کی جدوجہد آزادی کو ایک نئی قوت اور نئی تحریک بخشی، اگرچہ وہ سب موت کے آغوش میں آسودۂ خواب ہیں لیکن ارضِ وطن کی سیاسی کائنات میں جتنی صبحیں نمودار ہوں گی وہ ان مجاہدینِ آزادی کے ذکر کے بغیر نامکمل سمجھی جائیں گی، یہ سلسلہ وار تاریخ ہفت روزہ "قومی آواز" نئی دہلی کی اکثر اشاعتوں میں منظر عام پر آتی رہی ہے، افسوس کہ مارچ ۱۹۸۵ء کے بعد سے شاہ صاحب نے یہ سلسلہ درمیان میں منقطع کر دیا، سنا ہے کہ دو اور قسطیں آپ کی الماری میں بند ہیں۔

ایک اور کتاب متفرقات کے عنوان سے شائع ہوئی، اس میں انھوں نے تاریخی سیاسی اور سماجی مضامین کو یکجا کر دیا ہے، یہ ادب و انشاء کے شائقین کے لئے ایک حسین تحفہ اور علم و تحقیق سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے ایک حسین پیش کش ہے۔

ان کا ایک اور مستند وقیع اور علمی کارنامہ "حیاتِ انور" کی تالیف ہے، اس کتاب میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی مکمل اور جامع سوانح نیز ان کی علمی دینی، سیاسی اور مذہبی خدمات کا تفصیلی ذکر ہے۔

دوستانہ مراسم

شاہ صاحب نے سیماب اکبرآبادی، روش صدیقی وغیرہ سے اپنے خصوصی مراسم کا اکثر وبیشتر ذکر راقم الحروف سے کیا، سیماب اکبرآبادی کے منظوم ترجمۂ قرآن پر انھوں نے معرکۃ الآرا مقدمہ تحریر کیا۔ شاہ صاحب نے اپنی گفتگو میں اکثر و بیشتر مولانا ظفر علی خاں، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا مظہر علی اظہر، شیخ عبداللہ، غلام محمد صادق، مولانا مسعودی وغیرہ بہت سی عظیم المرتبت شخصیتوں سے اپنے گہرے تعلقات کا ذکر کیا۔

ذہانت اور قوتِ یادداشت

شاہ صاحب کی تحریر اور تقریر سے ان کی ذہانت خودداری اور قوتِ یادداشت کا علم ہوتا تھا، یہ صفات ان کو ورثے میں ملی تھیں، ان کے والد بزرگوار نے اپنی غیر معمولی جامعیت اور بصیرت سے مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا چراغ محمد لاہوری، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے جیّد علماء پیدا کئے، ظاہر ہے کہ اس چراغ سے روشن ہونے والا چراغ بھی کیسے ماند روشنی دے سکتا تھا، چنانچہ ازہر شاہ قیصر نے دل کی گہرائیوں خلوص، سادگی، قلندری اور اخلاقی بلندیوں سے جو شہ پارے بکھیرے ہیں وہ صحت مند ادب کا ایک لازوال حصہ ہیں، ان کی تحریریں ایک ایسے مخلص انسان کی یاد دلاتی رہیں گی جس نے زندگی کا بہترین حصہ ادب وصحافت کے لئے وقف کیا اور صحافت بھی انتہائی تعمیری اور قوم کو جگانے والی۔

ایک جگہ آپ لکھتے ہیں: "۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ قتل و غارت گری میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمٰن قرول باغ سے لٹ لٹا کر جامع مسجد کے پاس جامع ہوٹل کے ذرا قریب ادارہ شرقیہ کے ایک دو کمروں میں بڑی بے کسی کا وقت گذار رہے تھے، مسلم لیگ کے روزنامہ اخبار "ڈان" کا دفتر اور اس کی پریس پھونک دی گئی تھی، مشہور مجاہد آزادی ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی بیٹی زہرہ اور ان کے داماد شوکت اللہ شاہ کو دریا گنج میں اپنی کوٹھی چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جانا پڑا تھا، زہرہ اور شوکت اللہ کے اس حادثے سے گاندھی جی کو اتنا صدمہ ہوا تھا کہ انھوں

نے اسی شام ایک تقریر میں اس واقعہ پر اپنی بے چینی کا شدید اظہار کیا تھا۔

خواجہ حسن نظامی پاکستان نہیں گئے مگر چند ماہ کے لئے انھیں بھی حیدرآباد میں پناہ گزیں ہونا پڑا تھا، مشہور اہلِ قلم مولانا راشد الخیری کے دونوں لڑکے ادیب شاہد صدیقی، انصار فاخری، سید یوسف بخاری، سید وصی اشرف دہلوی، نہال سیوہاروی، ملا واحدی، حکیم عبدالحمید صاحب کے چھوٹے بھائی، حکیم محمد سعید ظفر قریشی یہ سب لوگ دہلی چھوڑ چکے تھے، دلّی کی اس پُر آشوب زندگی میں مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا امداد صابری، میر مشتاق احمد سیّد عزیز حسن بقائی، سید محمد جعفری، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا عبدالماجد دہلوی، یہ چند لوگ تھے جنھوں نے دن رات ایک کر کے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر مسلمانوں کو تھامنے اور سنبھالنے کی کوشش کی۔"

مختصر یہ کہ یہ ایک شیر دل انسان کی ناقابلِ فراموش داستان ہے، شاہ صاحب ۲۹ مارچ ۱۹۸۵ء کو دل اور سانس کی شدید تکلیف میں مبتلا ہوئے اور بالآخر ۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو تقریباً آٹھ ماہ کی شدید تکلیف اٹھانے کے بعد مالکِ حقیقی سے جا ملے اور دیوبند میں اسی جگہ مدفون ہوئے جہاں آپ کے والدِ ماجد مولانا سید انور شاہ کشمیری ابدی نیند سو رہے ہیں ؂

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

یہ ایک ایسے رئیس التحریر بلند پایہ صحافی کی داستان ہے جس نے سینہ سپر رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے دوستوں سے پیار کرنا سیکھا، اور باپ کی شفقت اور ان سے سیکھے ہوئے آداب ملک و قوم کی خدمت کے لئے برتے، انھوں نے ایک ایسی قوم کی رہنمائی کے لئے خود کو وقف کیا جو دھڑکتے دلوں کے لئے ایک دہکتا ہوا انگارہ بن چکی ہے۔

"اشاعتِ حق" دیوبند نے آپ کی وفات پر ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا، اس میں لکھا کہ:۔

"زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ بھی تو کچھ نہیں ہوتا، سانس کی نبضیں ساتھ چھوڑتی چلی گئیں، دل کی حرکت آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی اور آناً فاناً ۶۵ برس کی زندگی کا اس طرح خاتمہ ہو گیا کہ ہم کچھ بھی نہ کر سکے، نو مہینے جو شخص اس طرح ہمارے درمیان موجود رہا ہو کہ کوئی بھی لمحہ

رات اور دن میں ایسا نہیں آیا جس میں وہ تنہا رہا ہو، ۲۸ر نومبر کی صبح ۹ بجے قبرستانِ انوری میں تنہا اور اکیلا چھوڑ کر سپرد خاک کر آئے، ہزاروں من مٹی کے نیچے، ویران اور سنسان قبرستان میں، جہاں انسان وحشتوں اور سناٹوں کے درمیان آخرت کی ہولناکیاں برپا ہونے تک اپنا وقت گذارے گا۔

اس میں لکھا ہے کہ :

"یہی زندگی ہے اور یہی انسانی فطرت، ایک آتا ہے، ایک جاتا ہے اور آنے جانے کے اس عمل کے درمیان جو کچھ بھی کرنا ہوتا ہے وہ یہ کمزور اور ناتواں انسان ہی انجام دیتا ہے۔"

بلاشبہ انسانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ روزِ ازل سے قائم ہے اور قیامت تک چلتا رہے گا، مگر اس دنیا میں وہی لوگ نقشِ دوام چھوڑ جاتے ہیں جو اپنی شخصیت، اپنے بلند اخلاق و کردار، اپنے علم و فضل، شرافت و وضعداری، صبر و تحمل اور ضبط و استقلال کے سبب نوع انسانی کی خدمت کو فریضۂ عظیم تصور کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کو مجھ ناچیز سے بڑی محبت تھی، جب کبھی میرا دیوبند جانا ہوتا تو اکثر و بیشتر بلا تکلف غریب خانہ پر تشریف لے آتے اور پھر ذہن کے دریچوں اور نہاں خانوں سے ایسے گوہر آبدار بکھیرتے کہ حیرانی ہوتی تھی کہ شاہ صاحب کو یہ سب تاریخ کس طرح یاد ہے، اور یہ سب کچھ ان کے ذہن میں کس طرح محفوظ ہے۔

مولانا عزیر گل صاحب کے ساتھ تعلقات اور ان سے ملاقاتوں کا اور حضرت شیخ الہند کی مجالس کا اکثر ذکر فرماتے ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

جناب اظہر صدیقی صاحب

گہنا گیا ہے الفت و محبت کا آفتاب

سید محمد ازہر شاہ قیصر کی وفات حسرت آیات

تیرہ و تار تھی پہلے ہی یہاں شامِ حیات
دامنِ چرخ سے اک اور ستارہ ٹوٹا

دیوبند کے آسمانِ علم و ادب کا ستارہ، تاریخ و صحافت کا آفتاب درخشاں، وضعداری و شرافت کا دلآویز نمونہ اکابر دارالعلوم اور جماعت کے علوم و معارف اور تاریخی حقائق کے امین و مبصر، ملک کے ممتاز دانشور صحافی، ملت کے غم خوار درد مند فرد، شعر و ادب کی محفلوں کی شمع شبستاں، بڑوں کے نیازمند، چھوٹوں کے مخلص و مشفق مربی، دوستوں کے غمگسار، ساتھیوں کے معاون و مددگار، خوش مزاج و خوش اطوار، معصوم صفت، سادگی کا مجسمہ اور غرور و تکبر سے کوسوں دور، اکابرِ دارالعلوم کی صفِ اول، صفِ دوم، اور صفِ سوم کے فیض یافتہ، تہذیب و شائستگی، سادگی و انکساری کا پیکر، ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر، مدیر رسالہ دارالعلوم ۲۷ نومبر کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کو بیماری کے کئی جھٹکے لگے، امراض کے کئی سخت حملوں کا انھوں نے مقابلہ کیا، مگر ظاہری امراض کے علاوہ ایک تہہ نشین روگ، درد کسک، کرب بےچینی کی ایسی جانگداز روح فرسا اور دل و دماغ کو شکستہ احساسات کو مجروح اور فکر و شعور کو مردہ کر دینے والی اک کیفیت سے بھی ان کو دوچار ہونا پڑا تھا جو ان کا ذاتی قسم کا معاملہ نہ تھا، بلکہ ملتِ اسلامیہ ہند، جماعتِ دیوبند اور خود شاہ صاحب کے بہت سے قدیم مخلص اور چھوٹے بڑے رفقار کا درد و الم تھا، یہ ہی ان کے لئے ایک ناسور بن گیا تھا جس کا کوئی علاج نہ تھا جو کسی کو نظر نہیں آتا تھا، جس کا احساس و ادراک بھی ہر شخص نہیں کر سکتا تھا بلکہ وہی لوگ اس کو محسوس کر سکتے تھے جن کو خدائے بزرگ و برتر

نے فکر و احساس اور جذبہ کی تھوڑی بہت دولت سے نوازا ہے، وہ درد، وہ کسک، وہ سوزش، وہ زخم تھا، جماعتِ دارالعلوم، اکابرِ دارالعلوم اور عظمتِ دارالعلوم کے آفتاب درخشاں کا غروب ہو جانا، اس کا وقار، عظمت و رفعت اور نیک نامیوں کا مخالف، جوڑ توڑ، ہوس اقتدار، سیاسی بازی گردن کی بازی گری اور ظلم و جبر، قہر و ستم کی بجلیوں کی زد پر آکر جھلس جانا۔ وہ جماعتِ دیوبند اور وہ دارالعلوم جس سے ان کی وابستگی صرف ظاہری اور ضابطہ کی وابستگی نہ تھی بلکہ ان کے قلب و روح میں سمائی ہوئی تھی، انھوں نے اس ادارہ میں اس کی علم ریز اور حکمت بیز فضاؤں میں اور علم و شریعت سے لبریز ماحول میں آنکھ کھولی، بچپن کا نکھار اور جوانی کی بہاریں اس کی نذر اور ہر صلاحیت اس کے لئے وقف کی تھی، اور انقلاب و حوادث کے بہت سے طوفانوں کی بلاخیز موجوں اور پرہول تھپیڑوں کا ہمت، بہادری اور جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا، اپنا خون دل و جگر اس پر صرف کیا تھا، وہ علم و روحانیت کا آفتاب درخشاں اب ان کی نگاہوں کے سامنے گہنا گیا تھا، اس کی تابناکیاں ظلمتوں کے مہیب سایوں کی لپیٹ میں آچکی تھیں، اس شبستانِ علم و شریعت کے بہت سے جاں نثار پروانے اس کے فراق کی ہلاکت خیز و درد انگیز کیفیت اور ابتلاء و آزمائش کی ناقابلِ بیان زہرناک اور حسرت آمیز حالتوں سے دوچار تھے اور تاریخ کی سب سے بڑی سب سے شرمناک ڈھٹائی سفاکی اور غارت گری کا شکار تھے۔

یہ ہی تھا شاہ صاحب کا درد، یہ ہی تھا ان کا مرض، یہ ہی تھا ان کا داخلی کرب، یہ ہی تھا ان کے احساسِ فکر و شعور اور قلب و روح کا سب سے بڑا زخم، وہ ناسور جو ان کو گھلا رہا تھا، اندر اندر ختم کر رہا تھا، ان کی شمعِ حیات کو پگھلا رہا تھا اور ان کی شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور خوش فکری کو آنسوؤں کے سیلِ رواں کی شکل دے رہا تھا، اب شاہ صاحب تھے اور دل کا درد، روح کی بے چینی، شعور کی جراحتیں اور احساس کے زخم، شاہ صاحب کے چہیتے شاعر، مخلص دوست، ملت کے حسّاس و دردمند فرد الحاج جگر مرادآبادی کی زبان میں کیفیت یہ تھی ؎

دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن ٭ اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل

شاہ صاحب کی وفات ایک فرد ایک شخص اور ایک ذات کی موت نہیں ہے بلکہ ایک چمکتے دمکتے روشن اور ادبی و صحافتی دور کی موت ہے، ہماری تاریخ ملی کے وہ باب ہی اب بند ہوئے جا رہے

ہیں جن کے مطالعہ سے پڑھنے والوں کو فکر و شعور کی روشنی، عزم و عمل کی حرارت و قوت نصیب ہوتی تھی۔

بلاشک وشبہ شاہ صاحب دیوبند کے اہلِ قلم و اربابِ صحافت اور تاریخ و ادب کے اس گرانمایہ قافلہ کے روشن ستون اور قیمتی یادگار تھے جو ہند و پاک کے صفِ اول کے اہلِ ادب و صحافت تسلیم کئے گئے ہیں جن میں سید امتیاز علی تاج، مورخ اسلام سید محبوب رضوی، جناب مخمور عثمانی، مولانا انور صابری، علامہ حامد الانصاری غازی جیسے بلند مرتبہ حضرات سر فہرست نظر آتے ہیں، اسی قافلۂ ادب و صحافت کے گنے چنے وہ ایک ستارۂ آخر شب افق پر اپنی آخری چمک دکھا رہے ہیں اور ہند و پاک کے ادبی و صحافتی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر رہے ہیں۔

شاہ صاحب کی وفات کئی حیثیتوں کئی پہلوؤں سے نقصانِ عظیم ہے۔ دارالعلوم سے وابستہ سب ہی افراد ان کے نیاز مند رہے ہیں اور ان کی شفقتوں عنایتوں اور ادب و صحافت کے میدان میں ان کی گرانقدر و بیش بہا حوصلہ افزائیوں اور قیمتی مشوروں سے مستفیض ہوتے رہے ہیں

آج یہ ناچیز قلم، یہ دل و دماغ اور روح اس عظیم صحافی، خوش مزاج انسان، خورد نوازی کے اس پیکرِ جمیل کو بھیگی ہوئی آنکھوں، دُکھے دل اور گہرے جذباتِ الم کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بارگاہ رب قدیر و کارساز میں دست بدعا ہے کہ بارالٰہ تری شان مغفرت و رحمت عظیم ہے ہم گنہ گار و خطاکار بندوں کی التجا سن لے اور اپنی شان رحیمی کے صدقے میں سید ازہر شاہ قیصر کی بال بال مغفرت فرما دے، انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرما اور ان کے تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرما، آمین۔

درویش صفت شاہ

سیّد ازہر شاہ قیصرؔ

جناب حامد حسین صاحب

کس کی یادیں ہیں کس کی باتیں ہیں
خوشبوؤں کا یہ سلسلہ کیا ہے،

سیّد ازہر شاہ قیصرؔ جن کی انشاء پردازی کے چرچے اردو دنیا میں مشک و عنبر کی خوشبو کی طرح پھیلے ہوئے ہیں سادگی کا اعلیٰ نمونہ، فہم و فراست و خلوص کا ایک حسین پیکر تھے ان کا شمار ان شخصیات میں نہیں ہوتا جو پہلی نظر میں متاثر کر دیتی ہیں، انھوں نے اپنے لباس کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا اور نہ ہی اپنے ٹوٹے ہوئے دانت بنوانے کو ضروری خیال کیا سفید کرتا پائجامہ، سر پر عبداللہ کیپ، اور پاؤں میں کالے رنگ کی سینڈل پہنے نہایت سادگی اور بے تکلفی سے عمر گذار دی، دارالعلوم جیسے رسالے کے مدیر ہونے کے ناطے رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں جیسا رکھ رکھاؤ، ناز و نخرے اور شان و شوکت ان کو چھو نہیں گئی تھی، میں ان سے اکثر کہہ دیا کرتا تھا کہ شاہ جی! آپ کی شخصیت لندن کی اڈاوننگ اسٹریٹ کی طرح ہے جو باہر سے دیکھنے والے کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتی، لیکن اندر MODERN AMNITIES سے مزین برطانیہ کے وزیر اعظم کی اعلیٰ ترین رہائش گاہ شمار کی جاتی ہے۔ شاہ صاحب کا ظاہر بھی ایسا ہی تھا، ان کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی عظیم المرتبت شخصیت ہے جو سیّد ازہر شاہ قیصرؔ کے نام سے علمی، ادبی اور صحافتی دنیا میں جانی پہچانی جاتی اور ادب و احترام کی نظروں میں بسی تھی۔ ان کی شخصیت بادِ نسیم کے اس خوشگوار فرحت بخش جھونکے کی طرح تھی جو پھولوں کو پیار کرتی گذر جاتی اور کلیوں کا منہ چوم کر پھول بنا دیتی ہے۔

جب ان کی گفتگو کا رواں دواں دریا بہتا تو محفل کے گلشن میں معلومات کی کلیاں چٹخنے لگتیں

تر وتازہ پھول کھلنے لگتے، وقت کی گرد میں دبے واقعات کی پرتیں کھلتی جاتیں، ماضی کے آئینہ کی گرد دھلتی جاتی اور مخاطب کا دامنِ معلومات گوہرِ نایاب سے بھر جاتا، انھوں نے مجھے بتایا کہ مہاتما گاندھی ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ دیوبند آچکے ہیں، یہ وہ تاریخی حقیقت ہے جو اہل دیوبند پر منکشف نہیں تھی، معلومات کے ایسے ہی نادر ونایاب موتیوں سے شاہ صاحب کی یادداشت کا خزانہ بھرا تھا،

دنیا کی تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ عظیم شخصیات کے کارنامے تو زندہ رہے لیکن اکثر وبیشتر ان کے حالاتِ زندگی زمانے کے اندھیروں میں گم ہوکر تحقیق کا موضوع بنتا رہا ہے، چونکہ وقت کی بے رحم دیمک ان کو چاٹ جاتی ہے اور محققین روایات کے حاشیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، شاہ صاحب کی انشاء پردازی کی کہانیاں اور علمی وادبی شہ پارے اور ان کے اقتباس تو اہلِ علم وادب کے سامنے آتے رہتے ہیں اور آتے رہیں گے میری بدنصیبی رہی ہے کہ دارالعلوم رسالے کے چند اداریوں کے سوا میری نظر سے ان کی تحریریں نہیں گذریں، اسی لئے میرا یہاں موضوع اور مقصد اس عظیم ہستی کی ذاتی زندگی سے متعلق چند واقعات اور حقائق کا اندھیرے میں جانے کا راستہ روکنا اور تاریخ کے صفحات پر محفوظ کرنا ہے، جن کا میں چشم دید گواہ ہوں، ان سے اپنے تعلق اور رائٹر کے ناطے میری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ان واقعات وحقائق کو نئی نسل کو سونپ دوں۔

ایمرجنسی کے دوران شاہ صاحب دارالعلوم رسالے کی طباعت کے سلسلے میں کافی پریشان رہے، چونکہ ایک سرکاری حکم کے مطابق کسی رسالے کی طباعت سے پہلے متعین سرکاری آفیسر کو دکھا لیا جانا ضروری قرار دیا گیا تھا، اس وقت دیوبند کا ایس، ڈی، ایم داشنئی تھا جس نے اس مقصد کے لئے رسالے کی اشاعت پر پابندی لگادی تھی، جب تک شاہ صاحب مدیر کی حیثیت سے اس کی عدالت میں پیش ہوکر اس کو مطمئن نہ کردیں کہ اس کے مسودے میں حکومت کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے، شاہ صاحب ٹھہرے نہایت سیدھے انسان، بہت پریشان ہوئے، ان کو مولانا عبداللہ جاوید صاحب غازی پوری نے بتایا کہ آپ حامد تحسین سے رابطہ کریں، میں اس وقت دیوبند کانگریس کا جنرل سکریٹری اور دیوبند ایکسپریس ہندی/اردو کا مدیر تھا، میں نے شاہ صاحب سے

عرض کیا کہ ۱۱ بجے دفتر کے ملازم کو ایس، ڈی، ایم کی عدالت بھیج کر منظور شدہ مسودہ منگوالیں۔ ایسا ہی ہوا اور پھر شاہ صاحب کو کبھی بھی رسالے کا مسودہ ایس ڈی ایم کو بھیجنے اور منظور کرانے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ اس کی تمامتر ذمہ داری میں نے لے لی تھی، شاہ صاحب کی شرافت اور مزاج کو میں اچھی طرح سمجھتا تھا، شام کو شکریہ ادا کرنے میرے پاس آن پہونچے، یہ میری خوش نصیبی تھی کہ وہ اکثر و بیشتر مولانا عامر عثمانیؒ کی طرح میرے پاس تشریف لے آیا کرتے، گھنٹوں حالات حاضرہ پر گفتگو ہوتی اور گھریلو مسائل کے کانٹے نکالے جاتے۔

مولانا عبداللہ جاوید، عبدالعلیم خاں، عبدالخلیل خاں، ماسٹر سلیم صاحب، سید حسن حسین اور راقم الحروف کا ایک سال تک یہ معمول رہا کہ ہم عصر سے مغرب تک شاہ منزل پہونچ جاتے، شاہ صاحب نہایت خنداں پیشانی سے پیش آتے، کسی دن ان کی اہلیہ گھر پر نہ ہوتیں تو خود چائے بنا کر پلاتے، وہ خود ہر حالت میں بسکٹ چائے میں بھگو کر کھانے کے عادی تھے، وہ مولانا عبداللہ جاوید کو مولانا عبداللہ علیم خان کو خان صاحب اور مجھے ہمیشہ بھائی حامد تحسین کہا کرتے تھے، اور اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے چند سطری پرچوں میں بھی یہی لکھ کر مخاطب کرتے، مجھے حیرت ہوتی کہ باپ کی طرح پیار کرنے اور بیٹے کا درجہ دینے والا شخص بھائی کہہ کر کیوں بلاتا ہے، دراصل یہ ان کا خلوص تھا جس کے چراغ ان کے فکر و نظر میں ہمیشہ جلتے رہے، دوسرے ان کی شخصیت کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ عالم ہو یا جاہل، چھوٹا ہو یا بڑا ان کی محبت کا مستحق ہو یا شفقت کا وہ سب کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے، یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی عظمت کی شمعیں فکر و نظر میں روشن ہیں، اور ان کے اخلاقی قدروں کا ذائقہ زبان قلم پر دھرا ہے، جب ان کی باتوں کے پھول دل کے آنگن میں کھلتے ہیں تو زندگی مہکنے سی لگتی ہے انسان چلا جاتا ہے اپنی باتیں اور یادیں چھوڑ جاتا ہے، یہی باتیں اور یادیں زندگی کی راہوں پر بہت دور تک ہم سفر رہتی ہیں۔

سید ازہر شاہ قیصر مرحوم حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی سرپرستی اور مولانا محمد اسلم صاحب کی نظامت میں ہونے والے اجلاس صد سالہ ۱۹۸۰ء کی اعلیٰ اختیاری کمیٹی ان آٹھ معزز ممبران میں شامل تھے جس نے ۲۰ لاکھ مہمانوں کی میزبانی کے انتظامات نہایت ہی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیئے اور اجلاس کو کامیابی سے ہم کنار کر کے تاریخ دارالعلوم میں ایک سنہری باب کا اضافہ کیا۔

اس ناچیز کو بھی تین سب کمیٹیوں طعام، ٹرانسپورٹ اور پریس کی ممبری کا اعزاز حاصل تھا، کاموں کے انجام دہی کے دوران شاہ صاحب سے بھی واسطہ پڑتا، لیکن وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ ان کے اخلاق کے دامن پر میں نے کبھی احساس برتری کا کانٹا لگا ہوا نہیں دیکھا۔

آج بھی محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ؒ کے علم حدیث کی خوشبوؤں نے عالم اسلام کی فضاؤں کو عطر بیز کر رکھا ہے، دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ان کے ہزاروں شاگردوں کے ذہن مبارک سے ان خوشبوؤں کے دھارے پھوٹتے ہیں، اسی عظیم ہستی کو خراج تحسین پیش کرنے کے مقصد سے شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر کی سرپرستی میں ان کی حیاتِ مبارکہ پر ۱۹۷۹ء میں ایک سیمینار سری نگر میں منعقد ہونا طے پایا تھا، شاہ صاحب نے مقالہ نگار کی حیثیت سے مجھے بھی مدعو کر رکھا تھا، جب روانگی کی تیاری کا پروگرام بنا تو اندر ہی اندر مجھے نہ لے جانے کے لئے کھچڑی پکنے لگی، شاہ صاحب پر دباؤ ڈالا گیا، لیکن شاہ صاحب میرے پاس تشریف لائے، فرمایا میں تمھارا ریزرویشن کرا رہا ہوں، تمھاری منظوری کی ضرورت ہے، میں نے گھریلو مجبوری کی وجہ سے معذرت چاہی، لیکن شاہ صاحب کے اعلیٰ کردار اور وعدے کی پابندی دیکھ کر حیران ضرور تھا، بعد میں کچھ لوگوں نے مجھے بتایا کہ سری نگر میں تمھارے دوست برکت احسانی فوٹو گرافر نے دیوبند کے سبھی شرکاء کو پروگرام کے فوٹو نذر کئے اور اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا اور آپ کو نہ لے جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔

زندگی **MATHS** کا سوال نہیں ہے جس میں دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں، یہ زندگی کا حساب ہے اس میں کبھی کبھی دو اور دو پانچ ہو جاتے ہیں اور کبھی دو اور دو تین رہ جاتے ہیں، سید ازہر شاہ صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا رہا، زندگی کے ۶۵ ماہ و سال نے ان کو اتنی فرصت نہ دی کہ غموں کی گنتی کر سکتے یا آنکھوں میں مستقبل کے کچھ خواب سجا سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے والد محترم علامہ انور شاہ کشمیری کے نام کی وراثت سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور نہ ان کا یہ مزاج تھا، اس لئے زندگی سے ہمیشہ گھاٹے کا سودا کرتے رہے۔

"ابن الوقت" کی فصل اُگانے کی تخم ریزی اپنے بچوں کے ذہن کی دھرتی پر کرنے میں بھی وہ ناکام رہے، اس لئے ان کی اولادیں اپنے چہروں کو صاف ستھرے ہاتھوں کے پیالوں میں

لیے محرومیت کی دہلیز پر بیٹھیں بدلتے وقت اور دولت کی کرشمہ سازیوں کو حیرت سے دیکھ رہی ہیں، لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی علمی اور اخلاقی قدروں کی روایت کے پھول مولانا نسیم اختر شاہ قیصر اور وجاہت شاہ انور کے گھروں کے آنگن میں کھلے ہیں اور حسن نیت کے چراغوں سے ان دونوں بچوں کے گھروں میں اجالا ہے۔

۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کا وہ اندوہ گیں دن تھا جس میں ایک عظیم مفکر، عظیم صحافی، بے لاگ ادیب، بڑے باپ کے بڑے بیٹے، ایک شفیق مربی، عدیم المثال قوتِ حفظ کے حامل، صاحبِ طرز نثر نگار، اور بہت سی خوبیوں کے مالک، ابن الانور سیّد محمد ازہر شاہ قیصر اس عالم فانی سے رخصت ہوکر اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ سچ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی کو بقا نہیں، بڑی سے بڑی شخصیت اپنے اوصاف و محاسن کے جلوے دکھا کر بالآخر رخصت ہوجاتی ہے اور دنیائے فانی میں آمد و رفت کا سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے، مگر ان شخصیات میں بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے عظیم کارناموں اور بے لوث خدمات کے انمٹ نقوش سطحِ دل پر نقش ہوجاتے ہیں اور درازیٔ مدت کی گرد سے ان کے صاف و شفاف چہرے محفوظ رہتے ہیں، ایسی ہی ممتاز شخصیات میں سے ایک امتیازی شخصیت شاہ جی کی بھی تھی۔

تواضع ان کی فطرت ثانیہ تھی، چھوٹوں سے انتہائی تپاک کے ساتھ اس طرح ملتے کہ اپنی عظمت کا احساس تک نہ ہونے دیتے، حوصلہ افزائی اور ادنیٰ کو اعلیٰ درجہ تک پہونچانا اور اس پر اظہارِ مسرت ان کا مزاج تھا، ان کی ترقی سے خوش ہوکر مزید ترقی اور زندگی کی راہوں میں کامیابی کے گر بتاتے، ان کے پاس بیٹھنے والے، ان کے مجالس میں شرکت کرنے والے اور ان کے ماتحت کام کرنے والے حسبِ استعداد استفادہ کرتے، ان سے استفادہ کرنے والے اور ان سے فیض یافتہ سیکڑوں افراد اپنے وقت کے بہترین انشا پرداز اور شاعر بن گئے، ان کی قوتِ حفظ، وسیع معلومات اور علمی استعداد کے جوہر اس وقت کھلتے جب وہ کسی خاص موضوع پر گفتگو کرتے، کسی ادیب کے بارے

میں بات کرتے تو معلومات کا انبار لگا دیتے، کوئی شاعر موضوع سخن ہوتا تو خاص اس شاعر اور دیگر شاعر کے سلسلہ میں تسلی بخش معلوماتی گفتگو کر کے اور سیکڑوں اشعار سنا کر حیرت میں ڈال دیتے، قدرت نے جس فیاضی سے انھیں یہ نعمتیں عطا کی تھیں وہ انھیں عام کرنے میں بخل سے کام نہ لیتے۔

شاہ جی کو ذہانت و فطانت ورثہ میں ملی تھی اور یہ اسی کا اثر تھا کہ بات کی گہرائی تک پہنچ کر ایسے نپے تلے فیصلے زبان سے نکلتے کہ سننے والا پھڑک جاتا اور بے اختیار داد دینے پر مجبور ہوتا، ان کی تند آمیز مگر حقائق کی تلخیوں سے بھرپور نثر ان کی ذہانت اور قلم پر مکمل دسترس کی غماز ہے، شاہ جی کی ظاہری صورت اور سادہ وضع سے ان کی بے پناہ صلاحیتوں کا اندازہ کوئی مشکل سے لگا سکتا تھا وہ اوپر سے خاموش اور اندر سے بحر بیکراں کی طرح تھے

شاہ جی نصف صدی تک اپنے قلم کی ساری جولانیاں اخلاص کے ساتھ ملتِ اسلامی کی صحیح رہنمائی، اخلاقی و اصلاحی ادب کی ترویج زلفِ شعر و ادب کی تزئین اور بگڑے ہوئے معاشرہ کے سدھار میں صرف کرتے رہے، شاہ جی بلاشبہ ان مخلصین اہلِ علم کی پیڑھی کی آخری نشانی اور انمول یادگار تھے جنھوں نے اپنی قوتِ تحریر سے مسلم قوم کی درست رہنمائی کا عظیم فریضہ انجام دیا، بقول جگر مرحوم ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

"مچھلی کے بچہ کو تیرنا کون سکھائے؟" یہ جملہ بچپن سے کانوں میں پڑا ہوا تھا، مگر اس کی صداقت کا تجربہ اس وقت ہوا جب میرے والد صاحب قبلہ مرحوم نے یہ واقعہ گھر میں سنایا کہ لوگ شاہ صاحبؒ (حضرت علامہ انور شاہؒ) کے صاحبزادے کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ انھوں نے طفولیت کے زمانہ میں خلافت تحریک کے ایک جلسۂ عام میں معرکۃ الآرا تقریر کی تھی۔

اس بچہ کا نام جو اپنی عمر سے تینتیس برس آگے آگے چل رہا تھا "سید ازہر شاہ" تھا، پیدائشی ذہین وطباع، مقرر، صاحبِ طرز ادیب وانشاپرداز، بیباک صحافی ودانشور، دوستوں کا دوست اور اپنی ذات میں ایک انجمن۔

ان کا غائبانہ تعارف تو بچپن میں قبلہ والد صاحب نے کرا دیا تھا مگر دارالعلوم میں فارسی سے فراغت کے بعد عربی تعلیم کے دوران میں صورت آشنا ہوا، پھر رسم وراہ بڑھتی رہی اور ہم ایکدوسرے کے قریب آتے رہے، مدتوں راستہ میں کہیں ملاقات ہوجاتی تو علیک سلیک ہوجاتی، مزاج پرسی یا کچھ اِدھر اُدھر کی بات ہوجاتی، لیکن اخبار "دیوبند ٹائمز" کے اجراء کے بعد دیوبند میں شاہ صاحب کی صحافت سے استفادہ نہ کرنا چراغ کے باوجود اندھیرے میں بھٹکنے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب سے حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ کی ہمراہ شرف ملاقات نصیب ہوا، اخبار کے سلسلے میں مشورے اور مضامین کی اصلاح اور اس کی نوک پلک درست کرنا مستقل معمول بن گیا، شاہ صاحب کی عنایات ومہربانیاں اس قدر بڑھیں کہ مرحوم "دیوبند ٹائمز" کا ایک مستقل صفحہ "سیاسی حاشیے" کے عنوان سے برسہابرس تک لکھتے رہے، حالاتِ حاضرہ پر ان کے تبصرے رگِ احساس میں نشتر بن کر چبھ جاتے اور پڑھنے والا عش عش کر کے رہ جاتا، وہ لکھتے تو محسوس ہوتا کہ سارے جہاں کا

درد ان کے قلم میں سمٹ آیا ہے، مختلف مسائل پر شذرات اخیر شب میں سپرد قلم فرماتے .ع

"میں قوم کے غم میں روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے"

کی حقیقت جگا دیتے تھے۔

شاہ صاحب کو سوانحی خاکے میں رنگ بھرنے کا جو سلیقہ آتا تھا وہ اس دور میں بڑے بڑے ادیبوں اور صحافیوں کو نصیب نہیں، ملی، سیاسی شخصیتوں پر بہت سے مضامین دیوبند ٹائمز میں محفوظ ہیں جو ان کی انفرادیت کے اعتراف کے لئے کافی ہیں۔

شاہ صاحب نے اپنے قلم سے سیکڑوں نہیں ہزاروں ہی کو انشا پردازی سکھائی، اور دار العلوم کے طلبہ میں جس کو ذرا بھی اردو ادب سے شغف ہوتا شاہ صاحب اس کی صلاحیتوں کو جلا دینے کا بیڑا اٹھا لیتے۔

شاہ صاحب کو خدا نے تقریر اور تحریر کا ملکہ عطا کیا تھا ان کے والد بزرگوار حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح کے مشہور تلامذہ میں سے ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے، چنانچہ شاہ صاحب کو بھی ان کے علم، ذکاوت، حافظہ اور تقریر و تحریر کا فن ورثہ میں ملا تھا، آدمی کی تھوڑی سی گفتگو سے اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کس خیال کا آدمی ہے۔ اس کی باتوں کا جواب اور اپنے دلائل نہایت ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح پیش فرماتے کہ وہ قائل ہو جاتا، وہ نہایت سادہ منکسر المزاج اور وضعدار انسان تھے، ان کی زندگی سادگی اور شرافت کی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، ان میں سیدھا پن بہت تھا، باوجود ذہانت و سمجھداری، ذکاوت و دانشوری کے اگر ان کو کوئی دوست بہکانا چاہتا تو بہت آسانی سے بہکا لیتا، مگر دینی یا ملکی اور ملی مسائل میں ان پر کسی کا کوئی بس نہیں چل سکتا تھا، وہ اپنی فکر و نظر سے جو موقف متعین کرتے اس پر پتھر کی طرح بن جاتے تھے۔

مدت تک رسالہ دار العلوم کے ایڈیٹر رہے، دفتر میں اکثر احباب آجاتے اور فرمائش کرتے کہ شاہ جی چائے پلوائیے تو فوراً منگواتے، کبھی کبھی حضرت مولانا محمد عثمان صاحب بھی اس محفل میں شریک ہوتے اور حضرت مولانا شاہ صاحب سے دعوت کیلئے کہتے تو وہ فوراً دعوت کے لئے تیار ہو جاتے متعدد بار دعوتیں کیں، وہ حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ کا بہت احترام اور لحاظ کرتے تھے مولانا بھی

کبھی فرماتے تھے کہ بھائی شاہ صاحب سے دعوت کھانے میں مزہ نہیں ہے کیونکہ جب ان سے دعوت کو کہا جائے تو فوراً دعوت کر ڈالتے ہیں اور مجھے دعوت کھانے سے زیادہ دعوت طلب کرنے میں مزہ آتا ہے اس شخص کی دعوت بہت مزیدار ہے جو دعوت کے نام کو سنکر بدکتا ہے۔

اتر پردیش وقف بورڈ نے جب اضلاع میں اوقاف کمیٹیاں بنائیں تو حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ نے جو ان دنوں وقف بورڈ کے ممبر اور ایم، ایل اے تھے مولانا سید ازہر شاہ صاحب کو منتخب کیا اور ان کو ضلع وقف کمیٹی سہارنپور کا صدر نامزد کرایا۔ ضلع کے اوقاف کی اصلاح اور تنظیم کے لئے شاہ صاحب نے بہت کام کئے اور بہت سی تجاویز وقف بورڈ کے سامنے رکھیں اگر وقف بورڈ یوپی ان پر عملدرآمد کرتا اور کچھ توجہ کرتا تو بہت سدھار ہو سکتا تھا۔

میں شاہ صاحب سے ملاقات کیلئے گاہ بگاہ ان کے دولت خانہ پر حاضر ہوتا اور وہ بڑی محبت و خلوص سے بٹھاتے، گھر والوں کو فوراً حکم ہوتا کہ بھائی مولوی اعجاز آئے ہیں چائے بنا دو، اہل خانہ بھی مجھ پر ایسے مہربان ہیں اور خلوص و محبت سے پیش آتے ہیں کہ ان کو بھلایا نہیں جا سکتا، شاہ صاحب اتنے دلچسپ آدمی تھے کہ ان کے پاس بیٹھ کر اٹھنے کو دل نہ چاہتا، کسی ملاقات میں ایک دو گھنٹہ لگ جانا معمولی بات تھی، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، اور دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہ ہوتا جس میں ان کی نگاہ نہ ہوتی، وہ تنہا ایک انجمن اور گل صد بہار تھے، میں جب بھی ان کے یہاں جاتا تو حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ فرماتے کہ بس بھائی اب تم گھنٹوں کے لئے گئے، شاہ صاحب اپنے گھریلو کاموں میں بھی مجھ سے مشورہ کرتے اور میں مسائل کے حل میں حتی الامکان سعی کرتا۔

دارالعلوم کے قضیۂ نامرضیہ سے بہت غمگین اور نڈھال ہو گئے تھے، روحانی اذیت اور اندرونی گھٹن انھیں اندر سے کھوکھلا کرتی رہی اور بالآخر یہ حال ہو گیا کہ وہ مختلف امراض کی آماجگاہ بن گئے۔

اس زمانے میں جب شاہ صاحب سے ملاقات ہوتی تو لگتا تھا جیسے زیر لب گنگنا رہے ہیں ؎

میں جس کے ہاتھ میں اک پھول دے کے آیا تھا ؛ اسی کے ہاتھ کا پتھر مری تلاش میں ہے

میر تقی میر نے جس بیماریٔ دل کا تذکرہ کیا ہے وہ محض شاعری یا افسانہ ہے لیکن شاہ صاحبؒ کے حساس آبگینۂ دل کو حالات کے جو زخم لگے وہ اتنے گہرے تھے کہ میر کے شعر کا وہ حقیقی مصداق بن گئے ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ؛ دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

آج شاہ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے قلم و کاغذ لے کر بیٹھ گیا ہوں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ بات کہاں سے اور کیسے شروع کروں، کسی انسان میں ایک ہی خوبی ہو تو اس پر قلم فرسائی کرنا آسان ہے۔ لیکن جو انسان بے شمار صلاحیتوں اور گوناگوں قسم کی خوبیوں کا مالک رہا ہو اس کی مدح سرائی کا حق ادا کرنا متعسّر اور دشوار ہے۔

عام طور پر لوگ انھیں ایک ادیب ایک صحافی اور ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے، بلاشبہ وہ ایک اچھے ادیب ایک عمدہ اور بے نظیر صحافی تھے لیکن ان میں لاتعداد خوبیاں کچھ اور بھی تھیں جو ہر صاحب بصیرت انسان پر واضح تھیں۔ میں ایک مختصر سے مضمون میں ان تمام خوبیوں اور قابل ذکر صفتوں کا احاطہ نہیں کرسکوں گا۔ اجمال اور اختصار سے کام لیتے ہوئے میں اپنی اور ان کی چند ملاقاتوں کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کروں گا، یہ ملاقاتیں ماضی کی وہ سنہری یادیں ہیں جو شاید میری فانی زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہیں، ان کا تذکرہ سننے کے بعد قارئین کو خود اس بات کا اندازہ ہوجائے گا کہ شاہ صاحب صرف ایک ادیب اور صرف ایک رسالہ کے ایڈیٹر نہ تھے بلکہ ایک عظیم المرتبت اور رفیع الشان انسان تھے اور ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے کبھی کبھی اور کہیں کہیں پیدا ہوتے ہیں۔

میری یہ عام عادت تھی کہ جب میں زندگی کی کشمکش اور گرد و پیش کے ماحول سے گھبرا جاتا تو میرے قدم شاہ صاحب کے مکان کی طرف اٹھ جاتے، ان کا دولت کدہ غریب خانہ سے کافی فاصلہ پر واقع ہے، لیکن یہ فاصلہ کوئی فاصلہ نہ تھا۔ وہ اگر پہاڑ کی بلندیوں پر بھی جاکر بس جاتے تو وہاں پہونچنے میں بھی طبیعت کو اکتاہٹ نہ ہوتی، اس لئے کہ ان سے ملاقات کرنے کے بعد ہمیشہ یہ

محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے ذہن کی پریشانیاں اور روح کا بوجھ ان کے مکان پر چھوڑ کر واپس آ رہا ہوں، زندگی میں کئی موڑ ایسے بھی آئے کہ شاہ صاحب کی رہنمائی اگر میری امداد نہ کرتی تو شاید میں مایوسی کے کسی گہرے غار میں اوندھے منہ گر جاتا، غرض یہ کہ جب بھی زندگی میں کوئی نازک مرحلہ پیش آیا تو میں نے شاہ صاحب کے دہلیز پر دستک دی، ان سے ملاقات ہوئی اور پھر ان کی نرم گفتگو سے مایوسی کے بادل ایسے چھٹ جاتے کہ ذہن کا مطلع بالکل صاف ہو کر رہ جاتا، ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا کہ میں گردشِ لیل و نہار سے مرتعش اور مضطرب ہو کر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ان کی خدمت میں پہونچا اور جب واپس ہوا تو اس طرح کہ روح کیف و نشاط کی دولت سے مالامال تھی اور وہ اپنی دلفریب باتوں اور مسحورکن دلیلوں سے دامنِ دل پر اس طرح رفو کرتے کہ دل کی دھجیاں جامۂ ثابتہ میں تبدیل ہو جاتیں، واہ کیا خوب انسان تھے جو دوسروں کی ذات میں ڈوب جاتے، اب ایسے لوگ کہاں؟

میں ان کی خدمت میں پہونچتا تو ان کے چند لگے بندھے سوال یہ ہوتے تھے: کافی دنوں میں آئے؟ کہاں غائب تھے؟ گھر خیریت ہے؟ بچے ٹھیک ہیں، عامر صاحب کے بچے ٹھیک ہیں؟ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟ مزے میں ہو نا؟ ادارہ خدمتِ خلق کا کیا حال ہے؟ وہ ایک سانس میں یہ سب سوال اور ان جیسے اور بہت سے سوال کر ڈالتے، اور اگر میں ان سے اپنی کسی پریشانی کا ذکر کرتا تو برجستہ ایسے دلائل تصنیف کرتے کہ میں شرمندہ ہو کر رہ جاتا، ایک بار میں نے عوام کی طعنہ زنی کی شکایت کی تو ہنس کر میرا مذاق اڑانے لگے اور کہنے لگے کہ مطالعہ کے دوران شاید تم نے یہ کہیں نہیں پڑھا کہ آزمائش کام کرنے والوں ہی کی ہوتی ہے معذوروں اور اپاہجوں کی نہیں، ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاؤ نہ کوئی فقرہ اچھلے گا نہ الزامات کی بارش ہوگی ــــ فرمایا کرتے تھے کہ: مولوی صاحب عزت چاہتے ہو تو ذلیل ہونے کے لئے بھی تیار رہو، بڑے بڑے انبیاء جو عزت کی آخری شان تھے الزامات اور طعنہ زنی کے رنج سے تو وہ بھی محفوظ نہ رہے، میں اور تم کیا چیز ہیں؟

میں ان کی یہ باتیں سنکر شرمسار ہو جاتا اور پھر وہ موضوع بدلنے سے پہلے مجھے انتہائی شفیقانہ انداز میں مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کا درس دینے لگتے جو میرے لئے تریاق ثابت ہوتا اور میرے مفلوج ولولوں کو نئی زندگی مل جاتی۔

وہ صرف ذاتی معاملات میں ہی نہیں ملی اور اجتماعی مسائل میں بھی بڑی دل لگتی باتیں کیا کرتے

تھے ، دارالعلوم دیوبند پر جب غیر لوگوں کا قبضہ ہوا تو حلقہ حکیم الاسلام میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور شرافت و نجابت پر یقین رکھنے والوں کو بڑی خفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن ایسے نازک موقعہ پر بھی شاہ صاحب قیمتی ہی باتیں کرتے نظر آئے انھوں نے ایک بار دوران گفتگو میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک چال چلتے ہیں اور اس میں کائنات کے ہزار فیصلے ہوجاتے ہیں کچھ لوگوں کو بادشاہت مل جاتی ہے اور کچھ لوگ فقیر ہوجاتے ہیں، کچھ کو انعام ملتا ہے اور کچھ کو سزا۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ جب دنیا میں انقلاب آتے ہیں تو کچھ لوگوں کی دنیا بنتی ہے اور کچھ لوگوں کی آخرت، کچھ لوگوں کی ذمہ داریاں ختم ہوجاتی ہیں اور کچھ لوگ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر گہری آزمائش میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اتنا کہہ کر وہ حسب عادت ٹہلنے لگے اور پھر قریب آکر کہنے لگے اور ابھی دیکھو ہم تو شاید نہ رہیں تم دیکھنا کہ آخری فتح کس کی ہوتی ہے، دارالعلوم دیوبند میں ایک انقلاب اور آئیگا اور اسی وقت ہار جیت کا فیصلہ ہوگا ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کون ہارا اور کون جیتا۔

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کو وہ "بھائی جی" کہا کرتے تھے، ان کے انتقال پر میں نے شاہ صاحب کو بے حد ملول پایا اور دوران گفتگو میں کئی بار آنسوؤں سے روئے، ایک بار انھوں نے غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں یہ بھی فرمایا کہ حسن میاں! یہ ایسا وقت ہے کہ تم بھی دل کھول کر رو لو تم مجھ سے اظہار تعزیت کرو اور میں تم سے اظہار تعزیت کروں، میں نے انھیں صرف حضرت مہتمم صاحب کی وفات پر روتے اور بلبلاتے دیکھا ورنہ وہ ہر حال میں شگفتہ اور کھلکھلاتے نظر آتے۔

ان کی طبیعت میں مزاح کا عنصر غالب تھا جب وہ موڈ میں ہوتے تو ایسی ہنس مکھ باتیں کرتے کہ مجلس زعفران زار ہوجاتی، ایک بار میں نے عرض کیا شاہ صاحب ازدواجی زندگیاں بہت ناکام ہورہی ہیں بالخصوص مردوں کو یہ عام شکایت ہے کہ بیویاں لڑتی بہت ہیں، ہنس کر کہنے لگے سسرے بیوقوف ہیں اگر بیوی شوہر سے بھی نہیں لڑے گی تو پھر کس سے لڑیگی، مرد تمام عمر کبھی ماں کو نخرے دکھاتا ہے کبھی بہنوں کو، عورت بیچاری کو شادی کے بعد ہی نخرے دکھانے کا موقع ملتا ہے، اسکے بعد فرمانے لگے، جو عورت نخرے دکھانا نہیں جانتی وہ سب کچھ ہوسکتی ہے لیکن بیوی نہیں ہوسکتی اب جو لوگ عقل سے کورے ہیں وہ اس نخرے بازی کو لڑائی اور تصادم سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ میاں بیوی کا اختلاف بڑا ہی خوبصورت اختلاف ہے اگر جہالت اور حماقت کا شکار نہ ہو۔

بیشمار مجلسوں کی لاتعداد باتیں اوراق ذہن میں محفوظ اور موجود ہیں لیکن انشاءاللہ ان کا تذکرہ پھر کسی موقع پر کروں گا۔

میرے تائے ابّا

مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی، استاذ و نائب ناظم تعلیمات دارالعلوم (وقف)، دیوبند

بعض شخصیتیں ایسی پُرکشش اور اتنی جاندار ہوتی ہیں کہ ان کے نقوش تا دیر بلکہ کبھی کبھی تو ہمیشہ دل و دماغ پر مرتسم ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان کی عظمت و رفعت کا سکہ مدتوں تصورات و خیالات کی دنیا میں رائج رہتا ہے۔

تائے ابا حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر تغمدہ اللہ بغفرانہ کی شخصیت میرے لئے اتنی ہی پرکشش اور اتنی ہی جاندار تھی اور ان کی محبت میرے قلب و دماغ میں جاگزیں، میرا بچپن محلہ خانقاہ ہی میں گذرا اور میں ان کی گود میں خوب کھیلا اور شعور جب بالغ ہوا تو ان کے خیالات کے مطالعہ کا بھی موقعہ ملا، ان کو جانچا پرکھا اور کھرا پایا۔ میں نے والد محترم مولانا انظر شاہ صاحب سے بارہا سنا کہ مضامین کا سلیقہ ہمیں بھائی نے سکھایا بلکہ ابتداء میں ان سے اپنے مضامین پر اصلاح بھی لی۔

عجیب بات ہے کہ ۱۹۷۵ء میں گجرات کے ایک اسکول میں مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا، عنوان تھا "سیرۃ النبیؐ" انعام کافی رکھا گیا تھا۔ بچپن میں انعام کے شوق میں میں نے بھی چند الٹی سیدھی سطریں لکھیں، اور تائے ابا کے پاس دکھانے پہونچ گیا۔ بھلا کہاں میں اور کہاں ان کا قلم انھوں نے یکسر تمام مضمون پر قلم چلا دیا، مجھے سخت رنجیدہ اور اداس دیکھ کر خود اپنے قلم سے ایک مضمون تحریر کر دیا، میں نے وہ مضمون اپنے نام سے مقابلہ میں روانہ کر دیا، چنانچہ وہ مضمون نمبر اول قرار دیا گیا اور انعام کی رقم بھیجنے کا وعدہ کر لیا گیا، اب ادھر سے تاخیر اور ادھر سے اضطراب اور پریشانی میں نے منتظمین کو خط لکھا کہ آپ جلد میری رقم بھیجدیں، جواب آیا کہ آپ "خاطر جمع" رکھیں آپ کو رقم مل جائے گی، خوب یاد ہے کہ میں وہ جواب لے کر ظہر بعد بھاگم بھاگ دفتر رسالہ دارالعلوم پہونچ گیا وہ حسب عادت دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے کہاں پھر رہا! میں نے خط ان کے سامنے رکھ دیا، انھوں نے پڑھا، کہنے لگے کیا پریشانی ہے؟ میں نے کہا بھائی یہ "خاطر جمع" کیا چیز ہے اور اس کو کہاں جمع

کراؤں تاکہ رقم مجھے مل جائے۔ یہ سنتے ہی ان کا قہقہہ نکل گیا، دیر تک ہنستے رہے پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اہتمام کے دفتر میں لے گئے، سید محبوب رضوی صاحبؒ، مولانا عبدالحق صاحبؒ پیشکار وغیرہ تشریف رکھتے تھے، ان کو تمام واقعہ سنایا اور سب نے مل کر خوب لطف لیا، پھر مجھ سے کہنے لگے خاطر جمع، اطمینان رکھیں کے معنی میں ہے ـــــ تو یہ تھی ہماری قابلیت اور صلاحیت آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ کہاں سے ہم نے راہ نمائی حاصل کی تھی۔

پھر میں کوئی مضمون الٹا سیدھا لکھتا تو سیدھا ان ہی کے پاس لے جاتا، دو تین مرتبہ سنتے، بہت حوصلہ افزائی کرتے، اور بہت افہام وتفہیم سے کام لیتے اور نئے نئے عنوانات بتاتے کہ اس عنوان پر مضمون لکھو فلاں فلاں کتاب میں مواد مل جائیگا، یہاں تک کہ خود تمام مواد فراہم کردیتے، ان کے مزاج میں عجلت کافی تھی چنانچہ فوراً کہہ دیتے کہ لکھو میں بول رہا ہوں، اور پھر وہ انشار پردازی کا حق ادا کردیتے، ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، مضامین کا استحضار اور الفاظ کی ندرت اور موضوع کا تسلسل باقی رکھنا ان کا کمال تھا، وہ ہر چیز کو اپنے انداز پر سوچتے اور بے باکانہ اس کا اظہار کردینے کے عادی تھے، فیض احمد فیض ہندوستان آئے تو یہاں کے اخبارات نے ان کو حد سے زیادہ اچھالا، اور ان کی تعریف وتوصیف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا جانے لگا، فیض کی تعریف کے غلغلوں میں منفرد اور جچی تلی رائے صرف تائے ابا مرحوم کی تھی جس کا اخبارات میں انھوں نے برملا اظہار کردیا اور لکھا کہ فیض اس پائے اور اس صف کے شاعر نہیں جس کا زبردستی ان کو مستحق ٹھہرایا جارہا ہے۔

عصری مسائل پر ان کی نظر بہت گہری تھی، ملکی سیاست پر نہایت صحتمند اور متوازن تبصرے کیا کرتے تھے، شخصیات ان کا من پسند موضوع تھا، ان کو سیکڑوں شخصیتوں سے ملنے اور ان کے خیالات جاننے اور سمجھنے کا موقعہ ملا تھا، چنانچہ کسی بھی عالم، فاضل، ادیب اور شاعر کے بارے میں ان سے دریافت کیا جاتا تو فوراً ان کے واقعات سنانے لگتے اور ان کی پیدائش سے لے کر موت تک زندگی کے نشیب وفراز بتلایا کرتے تھے، ہزاروں شعر ان کو ازبر تھے اور وہ بلاتکلف سنانے پر قادر تھے۔

میرے دادا، اور اپنے والد حضرت امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ

کی ذات سے ان کو عشق تھا کسی نہ کسی رخ سے وہ مضامین میں ان کا تذکرہ کرتے تھے، کہتے تھے کہ اباجی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں، یہ تو میں برکت کے لئے ان کا تذکرہ کرتا ہوں۔

ہمیں بھی کہتے کہ اباجی پر تحقیقی مضامین لکھو، اپنی وفات سے نوماہ قبل انھوں نے مجھ کو آخری مضمون قلمبند کرایا، عنوان تھا۔ "علامہ سید انور شاہ اور ڈاکٹر اقبال" میں نے قلم سنبھال لیا تھا انھوں نے بولنا شروع کردیا، اول اقبال کی شخصیت، اس کی تعلیم، پروفیسر آرنلڈ کا اقبال پر گہرا تاثر، اس کے بعد حضرت شاہ صاحب سے ان کی عقیدت و وابستگی، نیز دونوں کی ملاقات بخدا وہ بول نہیں رہے تھے بلکہ الفاظ ان کی زبان سے پھسل رہے تھے، ادب و انشار کے گوہر آبدار تھے جو ان کی زبان سے جھڑ رہے تھے، یہاں تک کہ دادے ابا کا تذکرہ جب طویل ہوا تو ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

تقریر پر ان کو حیرت انگیز طریقہ پر قدرت حاصل تھی خوب یاد ہے کہ ۱۹۷۷ء میں مرحوم شیخ عبداللہ نے کشمیر میں حضرت علامہ سید انور شاہ صاحبؒ پر عدیم المثال سیمینار منعقد کرایا تو ہندوستان کے چیدہ و چنیدہ علمار دیدہ ور محقق اور ممتاز اہل قلم و دانشوروں کا قافلہ کشمیر کی سرزمین پر پہونچ گیا، ایک جمعہ کو میر واعظ کشمیر مولانا فاروق صاحب نے سری نگر کی جامع مسجد میں بعد جمعہ اچانک ان کی تقریر کا اعلان کردیا، وہ شیروں کی طرح منبر پر بیٹھ گئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کرلیں اور سیرت نبی کریمؐ پر ایک گھنٹہ برجستہ نہایت شستہ تقریر کی۔ قرآنی آیات و احادیث نبوی اور روایات کا انبار لگادیا اور اس کثرت سے کہ سامع کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگے۔

انھوں نے یہ آٹھ ماہ نہایت کرب و بے چینی میں گذارے، مجھے بہت کم ان کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔ بلامبالغہ ہمارے مختصر خانوادہ میں ان کو سب سے زیادہ مجھ سے تعلق تھا، گھنٹوں میرے ساتھ مختلف موضوعات پر بات کرتے، راستہ میں ملتے تو ہاتھ پکڑ کر گھر لیجاتے اخبار و رسائل جن میں ان کے مضامین شائع ہوتے وہ دیتے، پھر پوچھتے کہ "کیسا لگا مضمون"۔ میں بھی ان سے بچپن سے مانوس تھا، شام کے وقت احباب کے ساتھ خانقاہ جاتا اور ان کو بیٹھک میں بٹھا کر پانچ منٹ میں آنے کا وعدہ کرتا، اندر تائے ابا سے ملاقات ہوتی تو میں ان

کی گفتگو میں منہمک ہو جاتا، گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا، باہر احباب شور مچا مچا کر واپس چلے جاتے۔

میں آخر میں چار پانچ دن ان کے ہمراہ مظفر نگر میں جہاں وہ زیر علاج تھے نرسنگ ہوم میں رہا، صبح ہی وہ اخبار کے لئے اصرار شروع کر دیتے تھے، خود پڑھنے پر قادر نہ تھے تو تمام خبریں سنتے تھے۔

میرا نومبر میں والد صاحب کے ہمراہ اچانک پاکستان جانے کا پروگرام بن گیا، وقت کم تھا اور دہلی سے صبح ۴ بجے ہوائی جہاز سے روانگی تھی، نہایت عجلت میں شب کو ساڑھے دس بجے ان کی مزاج پرسی کرنے گیا، یہ میری اس ناسوتی عالم میں ان سے آخری ملاقات تھی۔

بارہ روز بعد پاکستان ان کی وفات کی اطلاع ملی — ہائے ابا! مجھے بہت دکھ اور افسوس ہے کہ میں آپ کے آخری سفر میں آپ کو کاندھا بھی نہ دے سکا۔ اب بتائیے میں کیسے "خاطر جمع رکھوں"۔ ہیچ پوچ قلم سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں میرا تأثراتی مضمون آپ کی ذات سے گہری وابستگی کا آئینہ دار ہے۔

میری بارگاہِ رب العزت میں دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور آپ کے مراتب کو بلند کرے۔ آمین یارب العالمین۔

اب سے ربع صدی قبل جن لوگوں نے دیوبند یا دارالعلوم کو دیکھا ہے یا جنھوں نے دیوبند کی صحبتوں سے لطف اٹھایا ہے وہ جب اس زمانہ کو یاد کرتے ہیں تو بے ساختہ ؎

ایک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے

کا مصداق بن کر رہ جاتے ہیں۔

آہ کیا زمانہ تھا! دیوبند کے سرسٹہ بازار سے دارالعلوم چوک تک ایسے ایسے ادیب صحافی، شاعر و نقاد مل جاتے تھے کہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر بھاری بھرکم ہونے کے باوجود ایسی منکسر المزاجی اور کسر نفسی کے حامل کہ آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ لیجیے ایک شخص رات کے دس بجے کے بعد جب دوکانیں بند ہوگئیں اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ دوکانوں کے لنٹر پر بیٹھا ہوا بیڑی پھونک کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز کبوتربازی یا پتنگوں کے پیچ پر محو گفتگو ہے، بال بکھرے ہوئے، چہرے پر سفید جھریاں، انگلیوں کے بیچ باربار بجھنے والی بیڑی کا ٹوٹا جسے استاد شبراتی ماچس سے باربار جلوا رہے ہیں، کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ ان انگلیوں کے درمیان جب قلم گرفت میں آجاتا ہے تو حکومت وقت کی نبض بھی چھوٹنے لگتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں صرف ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ پورے عالم کی تصویر ہے۔ اسکے دماغ میں ابھرنے والی فکر جو ملّتِ اسلامیۂ ہند کی سچی ترجمان ہے، جی ہاں، یہ جمیل مہدی ہیں، لکھنؤ سے شائع ہونے والے مشہور اردو روزنامہ کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، مالک اور سب کچھ! یہ کوئی موجودہ دور کا مقامی سطح کا اخبار نہیں، قومی سطح کا اخبار کہا

جاتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر آج کل اپنے وطن آئے ہوئے ہیں اور کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے کہ یہ کس سطح کے آدمی ہیں؟

اور یہ دیکھئے بازار میں ہٹو بچو کی صدا کے بیچ کتابوں پر نظریں جمائے ہوئے ہاتھوں میں سگریٹ اور قلم دبائے ہوئے چلا جا رہا ہے عصر کی نماز کے بعد اس شخص کا روز کا معمول ہے کہ دیوبند کی مشہور سوڈے کی دوکان مانسرودر کے یہاں جاکر بیٹھتا ہے اور "کھرے کھوٹے" کے عنوان سے موصول کتابوں کا پوسٹ مارٹم کرتا ہے، عوامی اندازوں کے مطابق" ملا ابن العرب مکی" کا "میخانہ" یہی ہے جس سے ہرماہ تجلی کو رونق ملتی ہے، "مسجد سے میخانہ تک" کا لوٹ پوٹ کرنے والا مضمون حضرت مولانا عامر عثمانی مرحوم یہیں ترتیب دیتے ہیں۔ یہاں سے مغرب کے وقت اٹھ کر یہ شخص پھر دیوبند کے عوامی حلقوں میں جا ملتا ہے۔ معلوم ہوا کہیں گلی ڈنڈا پر تبصرہ فرما رہے ہیں، تو کسی کو شطرنج کی چالیں بتا رہے ہیں، کہیں پتنگ بازی کے گُر سکھا رہے ہیں تو کسی کو بہترین مانجھا بنانے کا طریقہ بتلا رہے ہیں، عوام کو یہ معلوم بھی نہیں کہ یہ پتنگ باز، شطرنجی مختلف کھیلوں کا ماہر علمی حلقوں میں کس قدر مقبول ہے، اس کی شاعری کتنی دلفریب ہے؟ اس کے متنوع مضامین کس غضب کے ہیں؟

تھوڑا سا اور آگے چلئے تو معلوم ہوگا کہ ایک لحیم شحیم شخص رکشہ میں بیٹھا سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا ہوا، وعلیکم السلام! ابے او فلانے، ابے او فلاں کے بیٹے، ابے کیا حال ہیں تیرے، کہتا ہوا چلا آ رہا ہے، جگہ جگہ رکشہ رک رہا ہے، راستہ میں ہی کوئی سہرے کی فرمائش کر رہا ہے تو کوئی رخصتی کی، یہ حضرت کسی کو محبت بھرے انداز میں مغلظات سے نواز رہے ہیں تو کسی کو فی البدیہہ شعر سنا رہے ہیں، کسی سے اپنے تعلقات خاندانی بتا رہے ہیں، آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ اپنے وقت کے مشہور و معروف شاعر، شاعر انقلاب علامہ انور صابری ہیں، جن کی رسائی ایوانِ حکومت تک اتنی زیادہ ہے کہ آج کے دور میں اگر کسی کو اتنے مواقع مل جائیں تو وہ اپنی مقبولیت میں گم ہو کر زیڈ پلس سیکورٹی فراہم کراکے اپنی تشہیر کو فراوانی دولت کے لئے وقف کردے، لیکن واہ صابری صاحب! نہ کوئی اینٹھ ہے نہ غرور نہ کبھی اپنے تعلقات کی دھونس ہے اور نہ ہی کسی پر رعب داب

گوشت کی دوکانوں پر جائیے تو معلوم ہوگا کہ بھائی اختر کی دوکان پر صبح سے ایک شخص بیٹھا ہے، دوپہر ہوگئی، گوشت دوشت لے جانا تو شاید اسے یاد ہی نہیں رہا، کہیں کسی سے مذاق ہو رہی

ہے، کسی سے تفریح لی جا رہی ہے، کبھی سنجیدہ بحث چل رہی ہے۔ بیڑی کے ایک ایک ٹونٹے پر ماچس کی کئی کئی تیلیاں صرف ہو رہی ہیں، کوئی سہرے کی فرمائش کر رہا ہے تو کوئی رخصتی کی۔ یہ ہیں عقیل محزوں نیازی مرحوم، خداداد شعری صلاحیتوں کے حامل۔ فی البدیہہ شعر گوئی میں یدطولیٰ رکھنے والے شاعری ایسی کہ کسی کا سہرا لکھ دیا تو اسے ہی نہیں بلکہ اس سہرے کے سبھی کرداروں کو دیوبند کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنا دیا۔

غرضیکہ دیوبند کی زمین تھی اور چلتے پھرتے بے نفس و بے غرض اپنی اپنی جگہ پر ہر شخص معزز و محترم قابلِ قدر لیکن دیوبند کی نیرنگیوں میں مست! دیوبند میں اس قسم کے سینکڑوں اشخاص تھے جو شہرت کے بامِ عروج پر پہونچے ہوئے تھے، یہ سب کسی نہ کسی حد تک اس دارالعلوم کے فیض یافتگان تھے جو دیوبند کے ایک گوشہ میں خاموش طریقہ پر اپنی علمی خدمات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر رہا تھا، جس کی مسندِ اقتدار ایک ایسی پاکیزہ نفس کے ہاتھ میں تھی جس کا نام بھی طیب تھا جنھیں باشندگان دیوبند ہی نہیں بلکہ ملک و بیرون ملک کے سبھی عوام انتہائی عقیدت و محبّت کی نظروں سے دیکھتے تھے، جن کے منہ سے پھول جھڑنے اور شگفتہ کلامی کے باعث انھیں بجا طور پر "حکیم الاسلام" کہا جاتا تھا، جنھوں نے اپنی عمر کی ساٹھ برساتیں اس دارالعلوم دیوبند کو سجانے سنوارنے اور اسے ترقی سے ہم کنار کرنے میں صرف کیں جس سے انھیں چند طالع آزماؤں نے ان کے عمر کے آخری حصہ میں مختلف النوع بازاری الزام تراشیوں سے مطعون کر کے دارالعلوم دیوبند کی چہار دیواری سے نکالا، اور اس صبر و استقامت کے پیکر نے خندہ پیشانی سے اس زخم کو برداشت کر کے اپنا فیصلہ دنیا کی عدالت کے بجائے اس عدالتِ عظمیٰ کے مالک کے سپرد کر دیا جسکے یہاں ناانصافی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، بہر حال یہ ایک طویل داستان ہے جس کی تذکرہ نگاری یہاں مقصود نہیں۔ ذکر چل رہا تھا دیوبند، دارالعلوم اور اس کے بے غرض بندوں کا! انھیں میں ایک تھے شاہ جی مرحوم، یعنی سید ازہر شاہ قیصر، جن کے ساتھ رسالہ دارالعلوم کی ادارت وابستہ تھی۔

شاہ جی کو پہلی مرتبہ کب دیکھا؟ یہ تو یاد کے خانوں میں محفوظ نہیں، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ۱۹۶۲ء میں فارسی نصاب کی تکمیل کے بعد عربی سالِ دوم میں داخلہ پاکر جب اپنے کو "بڑا" محسوس

کرنے لگا اور کتابیں بغل میں داب کر احاطۂ مولسری میں واقع زینہ کے راستہ تعلیمات دفتر کے سامنے سے گذر کر مولانا ہارون صاحب کی درس گاہ میں جاتا تو قصداً اسی راستہ سے واپس ہوتا، کیونکہ زینہ کے قریب میں واقع رسالہ دارالعلوم کے دفتر سے نکلنے والے فلک شگاف قہقہوں میں اتنی کشش تھی کہ دل اس طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہتا۔ یہاں چند دوستوں کے درمیان جو شخصیت بطورِ ہیرو جاذبِ نظر محسوس ہوتی اس کا رنگ گندمی، قد و قامت درمیانہ، کھلی ہوئی پیشانی، قدرے بڑی بڑی آنکھیں موٹے موٹے ہونٹ اور ان پر بے ترتیب سی مونچھیں، خشخشی سی ڈاڑھی، چھوٹی مہری کا پاجامہ اور اوپر شیروانی جس میں کچھ قلم لگے ہوئے، محفل کو زعفران زار بنانے کی ذمہ داری اس ہستی کی تھی جس کو عرفِ عام میں "شاہ جی" کہا جاتا تھا، اور جن کا نام رسالہ دارالعلوم کے سرِ ورق پر "ابن الانور سید ازہر شاہ قیصر" لکھا جاتا

حقیقت یہ ہے کہ "شاہ جی" کی ذات اپنے میں انجمن تھی۔ شاہ جی بیک وقت مختلف حیثیتوں کے حامل تھے، وہ اگر ایک عالمِ دین کی حیثیت سے جانے جاتے تھے تو اردو ادب میں ان کا مقام بحیثیب ادیب مستند تھا، جہاں انھیں صحافت میں استناد کا درجہ حاصل تھا وہیں شعر گوئی میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے، احباب نوازی پر انھیں فخر تھا تو اولاد کی تربیت سے بھی یک لحظہ غافل نہیں تھے

شاہ جی کی شخصیت بڑی دلکش تھی، وہ کسی بھی ملنے والے کو اپنے سے متاثر کئے بغیر نہیں رہتے تھے، ان کی چھاپ جب کسی پر پڑ جاتی تو وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا، یہی وجہ ہے کہ ان کے ملنے جلنے والوں میں یا ان کے متعلقین میں عطاءاللہ شاہ بخاری رح، عبیداللہ سندھی رح، مفتی مہدی حسن مولانا محمد عثمان، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا سلطان احمد صاحب جیسے مختلف النوع بزرگ تھے تو ان کے حلقۂ یاراں میں مولانا اسلم، مولوی عبداللہ جاوید، قاری عبداللہ سلیم، مولانا عبدالرؤف عالی، جمیل مہدی، حامد الانصاری غازی، جیسی مختلف الجہات شخصیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔

مجھے شاہ جی سے ملنے کا اگرچہ کم اتفاق ہوا لیکن جب بھی ملا ان کے تئیں اپنے دل میں ایک نرم گوشہ پایا، دارالعلوم کے طالب علمی کے زمانہ میں رسالہ دارالعلوم سے انسیت تھی، اس وجہ سے جب بھی دارالعلوم دیکھتا اس کے مدیر "ابن الانور" کی طرف دل کھنچتا سا معلوم ہوتا لیکن حسبِ معمول اپنی لاپرواہی، تساہلی اور کاہلی کے باعث کبھی ملنا گوارہ نہ کرتا، شاہ جی کے منجھلے صاحبزادے مولانا نسیم اختر اور برادر زادہ مولانا احمد خضر شاہ سے حد درجہ تعلقات کے باعث شاہ جی سے کھل کر

ملنے میں تکلف مانع رہتا، اکثر و بیشتر یہ بھی ہوتا کہ ہم دوستوں کا حلقہ بنائے نسیم شاہ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہیں کہ شاہ جی کی آواز نے ہمیں "چڑی پتال" کر دیا۔ دارالعلوم سے فراغت ان ہنگامی ایام میں ہوئی جب بعض علمائے کرام جبہ و دستار کا بے مثال کھیل کھیل کر ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں اپنے اور عام مسلمانوں کے وقار کو داؤ پر لگائے ہوئے تھے۔ ان حالات کا چشم کشا سے مشاہدہ کرنے کی وجہ سے نہ تو ان حضرات سے عقیدت کا تعلق پیدا ہوا اور نہ ہی ان کی طرف طبیعت کا میلان ہوا۔

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے انتقال کے بعد شہر کے چند جوانوں کو مجتمع کر کے قاری صاحبؒ کی یاد میں کچھ علمی کام کرنے کی غرض سے جب طیب ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی تو اس وقت شاہ جی سے روابط پیدا ہوئے۔ اس کام میں انھوں نے مجھے انتہائی مفید اور قیمتی مشورے دیئے، تب مجھے معلوم ہوا کہ شاہ جی میں فکر کی کس قدر وسعت اور گہرائی ہے۔

۱۹۸۴ء میں حکیم الاسلام رح کی حیات و خدمات پر سیمینار کا داعیہ پیدا ہوا، طیب ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سیمینار کی تیاریوں کے پس پشت شاہ جی رح کے مفید مشورے شامل تھے، جب یہ سیمینار منعقد نہیں ہو سکا تو شاہ جی رح بہت زیادہ دل برداشتہ ہوئے، تب مجھے یہ احساس ہوا کہ شاہ جی رح کو حضرت حکیم الاسلام رح سے کس درجہ عقیدت و محبت تھی۔

سیمینار ہوا یا نہیں اس سے قطع نظر یہ فائدہ ضرور ہوا کہ شاہ جی رح سے بے تکلفی ہو گئی اور وہ حجاب جو ان سے ملنے میں مانع تھا وہ ختم ہو گیا، اب یہ ہوا کہ شاہ جی کی محفل میں بلا تکلف بول لیتا، اب مجھے اندازہ ہوا کہ شاہ جی میں کیا کشش تھی کہ ہر آدمی ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ان کی خوش خلقی ملنساری اور اپنائیت ضرب المثل کے طور پر مشہور تھی، یہی وجہ تھی کہ ان کا حلقۂ احباب وسیع تر تھا، اس حلقہ میں صرف ادبا، شعراء ہی نہیں تھے بلکہ صلحاء، اتقیاء، بزرگانِ دین، سیاسی و سماجی ورکر، غرضیکہ نوع بنوع افراد تھے جن کے درمیان شاہ جی شمع محفل کی طرح رونق افروز رہتے، ان سب کے باوجود شاہ جی رح کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ کسی کام کو کسی کی وجہ سے مؤخر نہ کرتے وہ اپنے معمولات و اوقات کے بے انتہا پابند انسان تھے۔ میری رفاقت اگرچہ ان سے زیادہ عرصہ نہیں رہی لیکن مجھے بہت جلد یہ محسوس ہو گیا کہ شاہ جی رح کے یہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے

وہ جب خطوط لکھتے ہوتے تو کوئی بھی آجاتا وہ اپنے خطوط کو پورا کرکے ہی دم لیتے، اردو ادب کے نثر نگاروں میں شاہ جی واقعۃً بلا کے لکھاڑ تھے ان کی نثر نگاری کے نمونے ان کی مطبوعات میں ابھی بھی محفوظ ہیں، عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ زیادہ لکھنے والا ادبی تحریروں کی طرف کم مائل ہوتا ہے لیکن شاہ جی کو اللہ نے یہ صلاحیت دی تھی کہ وہ زیادہ لکھنے کے باوجود عمدہ لکھتے تھے۔

انھوں نے رسالہ دارالعلوم کی ادارت (اور اس وقت کے دارالعلوم کی ادارت جب دارالعلوم کے سینہ پر شیخ الادب، شیخ التفسیر، شیخ الاسلام، حکیم الاسلام جیسے القابات سے نوازے جانے والے موجود تھے، جن کی علمی بصیرت سے بلاشک وشبہ بصارت سے محروم حضرات بینائی محسوس کرتے تھے) کی ذمہ داری جس حسن وخوبی، خوش اسلوبی اور نیک نامی کے ساتھ ادا کیں وہ قابل مثال ہے، ہر وقت ان کے ارد گرد رہنے والے احباب کے ہجوم میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ اپنا کام اس عرق ریزی اور انہماک کے ساتھ کرلیتے ہوں گے، آج کے دور کے تمام آسائش وتعیش سے آراستہ رسالوں کے دفاتر میں بیٹھے حضرات مدیرانِ کرام بھی کسی رسالہ کو اتنی پابندی کے ساتھ شائع نہیں کرتے ہوں گے جتنی پابندی کے ساتھ شاہ جی نے چالیس سال سے زائد عرصہ تک اس رسالہ کو نکالا، ان کے زائد از چالیس سالہ دور میں یہ رسالہ صرف ایک دفعہ تاخیر سے شائع ہوا اور وہ بھی ایسی ناگزیر حالات کی بنا پر کہ جن میں تاخیر کے بغیر چارۂ کار ہی نہیں تھا۔

بہرحال شاہ جیؒ کو دنیا سے رخصت ہوئے اٹھارہ سال ہوگئے لیکن ان کا سراپا اور ان کی یادیں آج بھی ذہن کے دریچوں میں اسی طرح محفوظ ہیں، ان کی سادگی، سادہ مزاجی، احباب نوازی، غربا پروری، بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے شفقت، اندازِ تربیت، اصلاحِ مضامین، پابندیٔ وقت، ایفائے عہد جیسے اوصاف آج بھی من وعن موجود ہیں۔ ۲۷ نومبر ۸۵ء کو شاہ جی کا انتقال ہوا تو محسوس ہوتا تھا کہ وقت کی نبض نے اس مسافر کے صحافتی سفر کو منجمد کردیا ہے لیکن اللہ کے فضل وکرم اور شاہ جی کی خصوصی تربیت نے اس گھرانہ سے دو اور صحافیوں کو جنم دیا، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، اور سید وجاہت شاہ انور المعروف بہ کمل دیوبندی، الحمدللہ دونوں ہونہار فرزندوں نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل کر موجودہ تقاضوں کے مطابق اپنا تحریری سفر جاری رکھا ہے، اس کو شاہ جی کی تربیت کا طفیل ہی کہا جاسکتا ہے۔

مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا نام صحافت وادب کی دنیا میں ناقابلِ فراموش ہے آج بھی ان کا نام آتے ہی ایک صاحب طرز ادیب، بیباک صحافی اور ہمہ جہت انشاپرداز کی تصویر سطح شعور پر ابھر آتی ہے۔ مولانا ایک اسلام پسند ادیب تھے اس لئے ان کی تحریروں میں اسلام کی سنہری روایات واقدار کی خوب تر پاسداری نظر آتی ہے۔ یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ "اسلامی ادب" کی آبیاری میں یا "تعمیری ادب" کے ارتقاء میں شاہ جی مرحوم کا ایک خاص رول ہے۔

پیدائش اور خاندانی نسبت:-

دسمبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند کے مشہور محلہ دیوان میں پیدا ہوئے، حضرت امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ اس وقت اسی محلہ میں قیام فرما تھے، تاریخی نام مظفر حسین رکھا گیا لیکن بہت کم لوگ اس نام سے واقف تھے، صحافت وادب کی دنیا میں "ازہر شاہ قیصر" اور اپنوں کے یہاں "شاہ جی" کے نام سے مشہور تھے، شاہ جی، مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے بڑے فرزند تھے، زندگی میں شہرت وعظمت اور راحت وسکون کے حصول کے لئے گرچہ یہ نسبت ضرورت سے بھی کچھ سوا تھی، چونکہ یہ دور حضرت امام العصرؒ کی علمی شخصیت اور کمالات کے عروج کا دور تھا، ان کی علمی شہرتیں سرحدوں سے پار نکل چکی تھیں، علمائے عالم میں ان کے علمی چرچے تھے، عوام میں محبت وعقیدت چہار سو پھیل چکی تھی، ظاہر ہے صاحبزادہ ہونے کا شرف ان کو (شاہ جی کو) حاصل ہو چکا تھا، لیکن شاہ جی نے جبہ ودستار سے الگ ہٹ کر اپنی پہچان بنائی اور علم وادب کی دنیا میں اپنے وجود کو تسلیم کرایا۔

مضمون نگاری کا آغاز:-

آپ کے والد حضرت امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیری ۱۹۳۳ء کو انتقال فرما گئے اس وقت شاہ جی کی عمر تیرہ برس رہی ہوگی، عالم اسلام نے اس صدمہ کو محسوس کیا، وفات کے بعد تعزیت کا ایک سلسلہ شروع ہوا بہت سے اکابر امت تعزیت کی غرض سے دیوبند آئے اسی سلسلہ میں ایک نام مولانا ظفر علی خاں کا بھی ہے، دیوبند کی جامع مسجد میں ایک تعزیتی جلسہ میں خاں صاحب شریک ہوئے، ان کی خدمت میں شاہ جی نے ایک سپاسنامہ پیش کیا، شاہ جی کے قلم سے نکلا ہوا یہ پہلا مضمون تھا ظفر علی خاں جیسے بلند پایہ ادیب، صحافی اور مشہور انشاپرداز کو یہ مضمون اس قدر بھایا کہ دیوبند سے واپسی کے بعد انھوں نے یہ سپاسنامہ اپنے مؤقر اخبار زمیندار کے صفحۂ اوّل پر شائع کیا۔ بقول شخصے تحریر و قلم کی دنیا میں اس سے زیادہ شاندار آغاز کس کا ہو سکتا تھا، اور کس کے لئے یہ فخر کی بات نہیں ہو سکتی کہ اس کا پہلا مضمون "زمیندار" جیسے مؤقر مشہور اور بلند اخبار میں شائع ہو، اس کے بعد عبرت و نصائح سے بھرپور مضامین کا جو سلسلہ شروع ہوا زندگی آخری سانس تک جاری رہا، ۱۹۳۹ء میں کچھ وقت کے لئے اخبار زمیندار میں اعزازی طور پر کام کرنے کا موقع ملا، ۱۹۵۱ء سے دارالعلوم کے ماہانہ علمی دینی رسالہ" دارالعلوم" دیوبند کے فرائض ادارت ان کے سپرد کیئے گئے، علاوہ ازیں، "انور"، "استقلال"، "ہادی"، "صداقت"، "اجتماع" اور ماہنامہ "طیب" جیسے مؤقر جرائد شاہ جی کی ادارت و سرپرستی میں شائع ہوئے ہیں۔ تاریخ کے بحر بیکراں سے سبق آموز شخصیات نکال لانا انھیں پسند تھا، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ "شخصیات" انکا پسندیدہ موضوع تھا، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اسی حلقہ کے اسیر بن کر رہ گئے ہوں، دینی و ادبی موضوعات پر بھی ان کا قلم بڑا رواں دواں چلتا تھا، شاعری جیسی الگ دنیا سے بھی ان کا خاصا واسطہ رہا گرچہ شاعری کو مستقل طور پر نہیں اپنایا لیکن بہت سی غزلیں، نظمیں، نعتیں، قطعات، رخصتیاں، سہرے ان کے مشہور ہوئے ہیں اور اخبار و رسائل کے لئے سامانِ زینت بھی بنے ہیں، ان کا یہ نعتیہ شعر ؎

غنچۂ دل کِھل اُٹھا صلِ علیٰ محمد ☆ باغِ جہاں مہک اُٹھا صلِ علیٰ محمد

آج بھی ذہن پر نقش ہے۔

بہت سے پرانے رسائل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابتداء میں قصے، افسانے، کہانیاں

وغیرہ بھی شاہ جی کے قلم سے نکلی ہیں، رسالہ "حور" "سہاگ" وغیرہ میں "دو عیدیں" "اسرار و بصائر" "ڈاکٹر" "انقلاب" "شرابی" "شاعر" "فریب" "آزادی" "بچے" "ٹوٹا ہوا آئینہ" وغیرہ جیسی بہت سی کہانیاں افسانے اور قصے ان کے شائع ہوتے تھے، لیکن اس جانب طبیعت کا میلان نہ ہونے کے باعث اس قسم کی تحریروں سے کنارہ کشی کرلی اور دیگر موضوعات کو اپنالیا۔ اس کے بعد شاہ جی نے "مقصدی صحافت" اختیار کی، "اذانِ بلال" اور "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" انکی تصانیف ہیں، "اذانِ بلال" اب کمیاب ہے، لیکن "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" اب بھی مقبول عام ہے۔

خوش خصال شاہ جی :-

نام سے ہی شاہ نہیں تھے بلکہ شاہ خوش خصال بھی تھے، گداز دل کے مالک، ہر ایک کے شریکِ غم، اخلاف پر شفقت اور ان کی حوصلہ افزائی خاص وطیرہ، اور تربیت کا جنون کی حد تک جذبہ، مہمان نوازی طرۂ امتیاز، مجھے یاد ہے بسترِ علالت پر دراز تھے، نواز دیوبندی کے ہمراہ میں بھی مزاج پرسی کیلئے گیا، اُٹھ کر بیٹھ گئے، "آؤ بھئی" اس محبت سے لبریز جملے کی حلاوت آج بھی تازہ ہے صاحبِ فراش تھے، اپنا دکھ درد اور حالِ پریشاں بیان کرتے ان کے بجائے میرے پورے گھر کی نام لے لے کر خیریت دریافت کی، اور پھر نواز بھائی سے مخاطب ہوکر "ارے نواز کیا کھائیگا" اپنی ایک نہ کہی اور اس حالت میں بھی درس کا باب کھول دیا، نواز دیوبندی اس دور میں "دارالعلوم دیوبند کی صحافتی خدمات" پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے، شاہ جی اس عنوان سے بہت خوش تھے اور نواز بھائی کی ہر قدم پر رہنمائی فرماتے تھے، اس حالت میں بھی شاہ جی نے اسی سے متعلق گفتگو کی، میں تو محوِ حیرت تھا کہ اس بیمار جسم کا ذہن کتنا صحت مند ہے، نام مقام تاریخیں واقعات روانی کے ساتھ زبان پر آرہے تھے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی ایک موقعہ پر بھی انھوں نے سن اور تاریخ کا حوالہ دینے کے لئے لمحہ بھر بھی غور کیا ہو، ایک ٹیپ تھا جو بج رہا تھا، معلومات کا ایک دریا رواں دواں تھا، شاہ جی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتے تھے، مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے، نہ خود رنجیدہ رہنا نہ کسی کو رنج پہنچانا، یہی وجہ ہے کہ چھوٹے ہوں یا بڑے یا پھر ہم محفل شاہ جی سب کے محبوب تھے سب کے عزیز تھے اور سب کے چہیتے تھے، دیوبند میں ادیبوں اور شاعروں کی ان کی زندگی میں ایک خاص مجلس مشہور تھی، جس میں مولانا عامر عثمانیؒ،

سیّد محبوب رضویؒ، قاری انعام الٰہیؒ، زبیر افضل عثمانیؒ، جمیل مہدیؒ اور خود شاہ جیؒ ایک جگہ جمع ہوتے شاہ جی اس محفل کے روح رواں رہتے۔ ان کی بذلہ سنجی، علمی قابلیت اور پُرگوئی کے علاوہ ان کی خوش خصالی کا بھی ہر شخص قائل تھا۔

مقصدیت اور اسلوب:۔

شاہ جیؒ کی تحریریں پڑھنے کے بعد یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ انھوں نے نام نمود کے لئے مقصد سے عاری صفحۂ قرطاس نہیں سنبھالے، بلکہ ایک خاص مقصد کے تحت اس سمندر میں غوطہ زنی کی ہے۔ مقصدی صحافت اختیار کرنا ہر دور میں دشوار رہا ہے۔ لیکن انھوں نے نیک مقصد کی تکمیل کے لئے اس کی پرواہ نہیں کی، کہا جا سکتا ہے کہ محض اسلامی نظریات اور اسلامی علوم میں توانائی بھرنے کی خاطر اور شعائر اسلام نیز مآثر دین کے دفاع میں انھوں نے قلم کی تلوار سے کام لیا۔ ان کی صحافتی زندگی کا مقصد اور نصب العین نہایت ٹھوس اور پاکیزہ تھا، یہی سبب ہے کہ اسلوب بیان میں ایک خاص قسم کی جاذبیت اور تاثیر پائی جاتی ہے، یہ بات سچ ہے کہ جس کا مقصد جتنا ٹھوس اور قوی ہوتا ہے اتنا ہی پُرتاثیر اس کا اسلوبِ بیان ہوتا ہے۔ جارج برناڈ شاہ نے اپنے مشہور ڈرامے "مین اینڈ سپر مین" کے دیباچے میں اس کا اعتراف ان الفاظ کے ساتھ کیا۔ مؤثر اسلوب بیان اسی شخص کا ہوتا ہے جس کے پاس کہنے کی کوئی خاص بات ہوتی ہے اور جس کا مقصد اپنے حالات کی تبلیغ ہوتی ہے، چنانچہ جس کا مقصد جتنا جاندار ہوگا۔ اتنا ہی جاندار اس کا اسلوبِ بیان ہوگا اسلئے کہ وہ اپنی بات کو زیادہ پُراثر بنانے کے لئے اپنے اسلوب کو اتنا ہی پُراثر بنائے گا۔

مؤثر اسلوب کا یہی فلسفہ ہے، شاہ جیؒ بھی ایک ٹھوس نظریہ کے حامل تھے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں معاشرے کی تعمیر انسانیت کی بقاء اور بے سمت و منزل مسافروں کی خضر کی مانند رہنمائی کی، چنانچہ حسین لب ولہجہ میں وہ اپنی بات کہتے، حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ابو الکلام آزاد نے شگفتہ اسلوب کی جو طرح ڈالی تھی شاہ جی نے اس کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ کروٹ بدلتے دور کے اعتبار سے آسان لب ولہجہ کے ساتھ اس کو اور زیادہ پُراثر بنایا، شاہ جی نے زندگی بھر اعلیٰ انسانی واخلاقی قدروں خدا پرستانہ نظامِ زندگی

کی اپنی تحریروں کے ذریعہ تبلیغ کی اور سنسنی خیز نیز سطحی صحافت سے پرہیز کیا۔

دارالعلوم دیوبند علومِ اسلامیہ کا ترجمان ہے، جہاں کی عظمت کا حال یہ ہے کہ اس مقام پر حدیث کو پڑھا بھی جاسکتا ہے اور اکابر کی زندگی میں دیکھا بھی جاسکتا ہے، رسالہ دارالعلوم اسی کعبۃ العلم کا ترجمان رہا، یہ ترجمانی کے فرائض تیز دھار پر چلنے کے مانند ایسے عظیم مرتبہ پر شوخ و شگفتہ اسلوب کا اختیار کرنا ہنسی کھیل نہیں، ایسے ماحول میں شاہ جی کی تبلیغ تلقینی اور عبرت آموز تحریروں میں زاہد خشک کی کھرداہٹ بھی ہوتی تو غیر فطری نہیں کہا جاسکتا تھا، لیکن شاہ جی کے اسلوب میں جذبات و جمال کے پیکر سمٹے نظر آتے ہیں، ان کے نرم و نازک اور جمیل الفاظ قاری کو اپنے سے باندھ لیتے ہیں، شاہ جی کے یہاں الفاظ کے جمالی پیکر شجر ممنوعہ نہیں تھے، چونکہ وہ بخوبی واقف تھے کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، نعیم صدیقی نے کسی جگہ لکھا تھا، "اسلام ہمہ تن ایک درسِ جمال ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ پوری زندگی حسن و جمال سے مالامال ہوجائے وہ خیالات و جذبات میں وضع قطع میں، بول چال میں، نشست و برخاست میں، میل جول میں، سیرت و کردار کی ساخت میں، نظامِ تمدن کی مجموعی حیثیت میں، غرض یہ کہ زندگی کے ہر گوشے میں حسن و جمال کی جلوہ گری چاہتا ہے" شاہ جیؒ نے اسلام کے اس درسِ جمال کو اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اتار لیا تھا، چنانچہ ان کے اسلوب میں بھی اسلام کا یہ درس صاف نظر آتا ہے، موضوع ہیئت کی دلفریب ترکیب اور اسلوب و ابلاغ کا جمالیاتی اظہار ایک زبردست ہم آہنگی کے ساتھ شاہ جی کی تحریروں میں رچا بسا نظر آتا ہے۔

شاہ جیؒ کا دورِ عروج جدید ادب اور ترقی پسند ادب کے غلبے کا ایک ہی دور ہے، اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس دور میں کہ جس کے پاس ٹوٹا اور بھونڈا قلم ہی تھا اس کو اس کی بڑی قیمت ملی، اہلِ قلم کی تلاش میں شکاری جال لئے پھرتے تھے، گلی گلی دلالوں کی بھیڑ چکر کاٹتی رہی جو ان کے ہاتھوں قلم بیچ گیا وارے کے نیارے ہوگئے لیکن شاہ جی اس قبیل سے تھے جو ترقی پسند تحریک کے انجام اور جدید ادب کی لاحاصل دشت نوائی سے واقف تھے، دولت و شہرت کی حرص و ہوس میں جس وقت نام نہاد مفکر اور اہل قلم اس جانب دیوانہ وار ہجوم کر رہے تھے، شاہ جی تنگ دستی کے باوجود اپنے ایک گوشے میں بیٹھے انشار و ادب

اور صحافت کی معرفت باطل نظریات کی آندھیوں سے نظریۂ اسلام اور سنہری اقدار کا دفاع کرنے میں مشغول تھے، شاہ جی جس پائے کے انشاپرداز تھے بکنے پر آتے تو دولت کے ڈھیر مل سکتے تھے ایک کوٹھی جوہو بمبئی میں ہوتی اور دوسری تاشقند میں، لیکن شاہ جی تو سرفروش تھے قلم فروش نہیں ان کی زندگی کا نصب العین اور صحافتی مقصد جمالی پیرائے میں اشاعتِ دین تھا۔

بیباکی و حق گوئی:۔

آج کے عام مبصرین اور تنقید نگاروں کی روش یہ ہے کہ کسی شخصیت یا ادبی تخلیق پر نقد وتبصرہ سے قبل اس کی شہرت وعظمت ورائے عامہ کا جائزہ لیتے ہیں، اس لئے آج نقد وتبصرہ کے پیمانے بکھرنے لگے، شاہ جی کے نقد وتبصرہ کا انداز نرالا تھا، مبتدیوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر ستائشی نوٹس پر اکتفا کر لیتے، لیکن زعماء کی سخت گرفت میں نہیں چوکتے تھے، ان کے تبصرے میں نقد کی وہ نشتریت ہوتی کہ مخاطب بلبلا کر رہ جائے۔ ایک مرتبہ فیض احمد فیض کی آمد کا ہنگامہ تھا، شاہ جی نے لکھا کہ فیض اس پائے اور صف کے شاعر نہیں جس کا زبردستی ان کو مستحق ٹھہرایا جا رہا ہے، اسی طرح احسان دانش پر لکھے مضمون میں برملا اظہار کیا، احسان کی شاعری نہ جوش کی شاعری کی طرح ثقیل ہے نہ سیماب کی طرح بہت حد تک بے روح اور کثرتِ مشق کی آئینہ دار نہ ظفر علی خان کی طرح بے رنگ وبو ہے پٹھانوں کی طرح سخت اور نہ علمائے کرام کے مواعظ کی طرح خشک اور نہ ساغر کی شاعری کی طرح خام کارانہ اور ابتدائے عمر کی گلی کوچوں میں آوارہ وناکارہ، ان میں زیادہ نام ایسے ہیں جن سے شاہ جی کا براہ راست تعلق تھا خاص طور پر علمائے کرام کے حلقہ سے تو وہ خود بھی وابستہ وپیوستہ تھے، لیکن ان کی حق گوئی میں اس قسم کی کوئی چیز مانع نہیں تھی۔

اردو کی ترقی میں شاہ جی کا حصہ:۔

شاہ جی نے اپنے ایک مضمون 'اردو کی ترقی میں مذہبی مصنفین کا حصہ' میں لکھا ہے کہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اردو میں نظم ونثر کی باقاعدہ تحریر کا آغاز مذہبی حلقہ سے ہوا اور مضمون کے آخر میں رقم طراز ہیں کہ صنف تحریر کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک کی زیادہ تر خدمات کو سامنے رکھ کر اسے ماننا پڑیگا کہ مذہبی حضرات نے اردو لٹریچر اور اردو تصانیف کی

ابتدا کی اور مذہبی حضرات کی توجہ سے اردو کو ترقی اور پھیلاؤ ملا۔

(رسالہ دار العلوم اگست ۱۹۸۰ء)

راقم اپنی بات اس دعویٰ پر ختم کرتا ہے کہ ۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو دار فانی سے کوچ کر جانے والے مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ بھی ان ہی مذہبی حضرات میں سے ایک تھے، جن کے دم سے اردو کو ترقی اور پھیلاؤ ملا۔

دیوبند کی سرزمین کو ہمیشہ اس پر فخر رہے گا کہ اس نے اپنی آغوش میں ان لوگوں کی پرورش کی جو زمانہ ساز تھے اور ان ہستیوں کو جنم دیا جنھوں نے زمانے کو تقویت و توانائی اور رنگ و نور بخشا۔ ایک سے ایک باکمال ہستی، ایک سے ایک نورانی پیکر اسی خطۂ زمین سے اٹھا اور تمام عالم پر چھاتا چلا گیا، اسی کی خاک میں وہ علماء و فضلاء اور مشاہیر وقت مدفون ہیں جن کی زندگیاں اعلاء کلمۃ الحق کے لئے وقف تھیں اور جنھوں نے اپنے علم اپنے کمال اور اپنے افکار سے ایک دنیا کو روشنی و تابندگی عطا کی، ہم دیوبند کی ہستیوں پر اور ان کے محیر العقول کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں علمائے دیوبند نمایاں اور ممتاز نہ نظر آتے ہوں، علم و ادب صحافت، کمال، بزرگی، تقویٰ، پاکیزگی، کوئی گوشہ ایسا نہیں جو علمائے دیوبند کے نورانی وجود سے نہ جگمگاتا رہا ہو اور ان کے کارناموں سے زندگی نہ حاصل کر رہا ہو۔

دیوبند نے ادب و صحافت اور انشاء پردازی کے میدان میں بھی اپنے دیرپا نقوش چھوڑے ہیں اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان نقوش کا رنگ گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں کی ادبی و صحافتی زندگی کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں وہ بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز موجود رہے جن کی خدمت کا دائرہ نہایت وسیع اور جن کے افکار کی ایک دنیا معترف نظر آتی ہے۔

دیوبند سے جاری ہونے والے اخبارات و رسائل پر ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں سے جاری ہونے والے رسائل و جرائد کی ادارت کے فرائض ان حضرات نے انجام دیئے جنھوں نے علم و ادب اور صحافت و انشاء پردازی کے وہ شہ پارے تخلیق کئے جن کو ہندوستان کے کسی بھی ادیب اور انشاء پرداز کی تحریروں کے مقابلے میں آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے

اور جب بات چلتی ہے اخبارات و رسائل کی ادارت کی تو ایک نام خود بخود ذہن کی سطح پر ابھرنے لگتا ہے اور وہ نام ہے صاحب طرز انشا پرداز صاحبزادۂ امام العصرؒ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحب مرحوم کا، ان کو بلا شبہ یہ ممتاز مقام حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی صحافتی اور ادبی زندگی میں اتنے اخبارات و رسائل کی ادارت کی کہ دیوبند اور دیوبند سے باہر ہمیں کوئی دوسری شخصیت ایسی نظر نہیں آتی جس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو یا اس نے اپنی زندگی میں اس جان جوکھم والے کام کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا ہو۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحب مرحوم نے کل نو برس کی عمر میں اپنی صحافتی اور ادبی زندگی کا آغاز کیا، اور ان کے ادبی و صحافتی سفر کا اختتام اس طور پر ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، تحقیقی، تاریخی، مزاحیہ وغیرہ مضامین انھوں نے اپنے پیچھے چھوڑے اور کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں، دراصل لکھنے پڑھنے کا وہ سلیقہ ان کو قدرت کی جانب سے ودیعت کیا گیا تھا جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

چنانچہ آج کے مشہور روزنامہ اخبار قومی آواز میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے، رسالہ طیب ان کے اعلیٰ مضامین سے آخر وقت تک زینت پاتا رہا، پھر ہفت روزہ قومی آواز میں تو ان کے سلسلہ دار مضمون "سفینۂ وطن کے ناخدا" کا سلسلہ تو کافی طویل بھی رہا اور بہت زیادہ پسند بھی کیا گیا، غرضیکہ شاہ صاحب مرحوم کی کتابِ زندگی کا ہر ورق تحریر و قلم کی روشنی سے منور رہے، ہمارے اپنے خیال میں دیوبند سے جاری ہونے والا کوئی پرچہ ایسا نہیں ہے جس میں ان کے مضامین نہ شائع ہوئے ہوں، ان کا قلمی تعاون ہر پرچے کے ساتھ جاری رہا، انھوں نے اپنے قلم و فکر کی تمام تر توانائیاں صالح فکر اور بیداری کی لہر پیدا کرنے میں صرف کر دیں، ان کے قلم سے ہزاروں دینی اور مذہبی مضامین سامنے آئے جو یقیناً ان کے لئے ذخیرۂ آخرت ہیں، ان میں اپنے بزرگوں اپنے بڑوں اور اپنے اکابر کے واقعات، ان کی پاکیزہ زندگیوں کے ایک ایک گوشہ کو سامنے لانے اور عوام کے سامنے پیش کرنے کا ایک زبردست جذبہ تھا، چنانچہ ان کی تحریروں پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے اکابر پر بے انتہا لکھا اور خوب لکھا، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے وقت کے مشاہیر علماء کو دیکھا، ان کی صحبت

اختیار کی، ان کے قریب رہے ان کو نہایت قریب سے پرکھا اور جانچا، اسی لئے وہ ان کی اداؤں اور ان کی باتوں پر جان دیتے تھے اور ہر ممکن کوشش کرتے تھے کہ نئی نسل بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلے اور جو زندگیاں انھوں نے گذاری ہیں اسی انداز سے اپنے اوقات بسر کرے۔

دیوبند ٹائمز دیوبند سے جاری ہونے والا واحد اخبار ہے جو اپنی ابتدا سے لے کر آج تک پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، یہ امتیاز دیوبند کے کسی اور اخبار کو حاصل نہیں دیوبند ٹائمز کے لئے شاہ صاحب مرحوم کا قلمی تعاون زبردست طریقے پر رہا، ان کے مضامین ایک بڑی تعداد میں دیوبند ٹائمز کے صفحات پر آئے اور انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے طویل سلسلہ وار مضمون "سیاسی حاشیے" بھی دیوبند ٹائمز کے لئے لکھا، اگر یہ سلسلہ وار مضمون ایک ترتیب کے ساتھ سامنے آجائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے جو گذشتہ دس پندرہ سالوں کی معتبر و مستند سیاسی سماجی تاریخ بن سکتی ہے اور امید کرنی چاہئے کہ انشاء اللہ ان کا یہ طویل مضمون ایک دن ضرور منظر عام پر آئیگا۔

موت ایک حقیقت ہے اس سے کوئی بچ نہیں سکتا، ہر فرد اور ہر بشر موت کی وادیوں میں جا سوئے گا، اس ٹھوس حقیقت کے باوجود انسان کی جدائی کا احساس ہمہ وقت رہتا ہے، پھر انسان کی زندگی اتنے رشتوں اور ناتوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے کہ کسی کے جانے کا احساس نہ ہونا ناممکن ہے اور پھر ایسے اشخاص تو زندگی کی ہر ساعت میں یاد آتے ہیں جن کی اپنی ایک حیثیت اور اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔

والد مرحوم مولانا سیّد محمد ازہر شاہ قیصر ۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کی شام اس دنیا سے رخصت ہو گئے یہ کوئی نئی بات نہیں، کوئی نادر الوجود چیز نہیں، صدیوں سے آمد و رفت کا یہ سلسلہ چل رہا ہے اور قیامت تک چلتا رہے گا مگر وہ اشخاص جو دوسروں کے لئے جیئے، دوسروں کو زندگی کی خوشیاں بخشتے وہ ہر وقت یاد آتے ہیں۔

شاہ صاحب مرحوم اردو کے ایک مستند ادیب، بلند فکر صحافی اور اعلیٰ پائے کے انشاء پرداز تھے، تحریر و قلم جن کی زندگی، اعلیٰ ادب کی تخلیق جن کا نصب العین، دینی اور مذہبی تعلیمات کی اشاعت جن کا مقصد، صحافت کی وادیوں میں سچائی اور ایمانداری و حق گوئی جن کا شعار تھا انھوں نے اپنی زندگی میں لاتعداد مضامین تحریر کئے، اور ہزاروں تحریریں ان کے قلم سے سامنے

آئیں اور صفحات کے صفحات ان کے بلند پایہ مضامین سے بھرے پڑے ہیں، دیوبند کی ادبی وصحافتی زندگی میں وہ ممتاز اور نمایاں شخصیت کے مالک تھے، ان کی تحریریں اتنی جاندار اور اس قدر شیریں ہوتی تھیں کہ ہر موضوع اور ہر عنوان پر لکھتے وقت ان کی یہ انفرادیت ہمیشہ قائم رہتی تھی پڑھنے والا بور ہوجائے یا اکتا جائے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ اس قدر چست اور مکمل ہوا کرتا تھا کہ پڑھنے والے عش عش کر اٹھتے تھے، سلاست وروانی ایسی کہ پڑھنے میں کم ہی نظر آتی ہے۔ وہ منفرد انداز تحریر کے مالک تھے اور صحیح معنی میں صاحبِ طرز انشاپرداز تھے۔

ان تحریروں کا ایک بڑا زبردست ذخیرہ موجود ہے، ان کی پوری عمر لکھنے اور پڑھنے میں گذری، آج ان کے مضامین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے، عمر کی ان ساعتوں میں جب بیماری نے سخت ترین گرفت میں لے رکھا تھا اس وقت بھی ان کے لکھنے کا سلسلہ جاری رہا وہ آخر وقت میں لیٹے لیٹے مضامین بول دیتے اور لکھنے والے لکھ لیا کرتے مگر اس بیماری کے دوران ان کی آواز اتنی پست ہوئی کہ زبان سے باوجود کوشش کے صاف الفاظ ادا نہیں کرپاتے تھے۔ گویا ؎

مدت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف نہیں ہے

جناب ڈاکٹر ظفر مراد آبادی

فخرِ کشور

۱۴۰۶ھ

عالی نژاد اظہر شاہ قیصر

۱۹۸۵ء

(ا) انشاء صحافت کا وہ اسلوب اچھوتا — (ا) اصحابِ نظر جس کی نہ تہہ پائیں وہ دریا (ا)

(ظ) ظاہر ہو کہ باطن، سبھی تحریر میں محفوظ — (ظ) ظلمت کو ملے نور بداماں سبھی ملفوظ (ظ)

(ہ) ہر زخم کو دے مرہمِ الفت کا لبادہ — (ہ) ہوتا ہے کہاں وقت کا دل اتنا کشادہ (ہ)

(ر) روکش جو سیاست پہ ملی چشمِ گہربار — (ر) رہبر بھی ملے مذہب و ملت کے طرفدار (ر)

(ش) شاداب و مرصع ہے ہر اک طرزِ نگارش — (ش) شہ زورِ قلم بھی کریں تحسین کی بارش (ش)

(ا) احسان، جگر، جوش، روش فیض سبھی کا — (ا) آئینہ اشعار میں دیکھا ہے سراپا (ا)

(ہ) ہر حرف کہ ہے فکر و بصیرت کا شہنشاہ — (ہ) ہے خامہ بہر علم و فراست کی گزرگاہ (ہ)

(ق) قالب میں جب انساں کے ڈھلے وقت کے آفاق — (ق) قرطاسِ ہنر بن گئے تاریخ کے اوراق (ق)

(ے) یاقوت و جواہر کی چمک ماند پڑی ہے — (ے) یک شمع اگر سیرتِ حسنہ کی جلی ہے (ے)

(ص) صناعِ ازل کیلئے ممدوح کا اخلاص — (ص) صدحسنِ عقیدت سے ہر اک لفظ ہوا خاص (ص)

(ر) رہتے ہیں سدا زندہ و جاوید وہ گوہر — (ر) اوجِ غمِ دنیا ہوں جو عقبیٰ کا بھی محور (ر)

آسمانِ صحافت کا ایک اور چراغ گل ہوگیا

مولانا صادق علی قاسمی بستوی

یگانۂ روزگار، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری ؒ کی ایک زندہ یادگار مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر، آسمانِ صحافت کا آفتاب کامل بھی غروب ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ منحوس خبر سن کر دل کو زبردست دھکا لگا، دماغ کئی دن تک متاثر رہا، مگر کیا کیجیے یہی نوشتۂ قدرت اور قانونِ الٰہی ہے، اسی طرح ہر ایک کو یکے بعد دیگرے اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کرنا ہے، یہی ہوتا چلا آیا ہے، اور آئندہ بھی یہی سلسلہ جاری رہے گا کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، نبی ہو یا ولی ہو موت سے کسی کو رستگاری نہیں، دراصل ایسے وجود کا بھروسہ ہی کیا جو "نہیں تھا" اور "نہیں رہے گا" کے درمیان پل کا مہمان ہو سہ

کون ہے دنیا میں رہنے کے لئے ؞ زندگی سب کی ہے کہنے کے لئے

دو پل کا وجود اور ایک آن کی زندگی کا حال ایسا ہی ہے جس طرح چکی کے دو پاٹوں کے درمیان گیہوں کے چند حقیر دانے، مختصر سے وجود کے ماقبل ومابعد دو عدم، چکی کے دو پاٹ ہیں ہر دو کے بیچ وجود کسی وقت بھی پس سکتا ہے، دم توڑ سکتا ہے اسی لئے ممکنات میں وجود کو ایک شئی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا کہ دو عدموں کے درمیان وجود بھی عدم ہے، پھر ایسے وجود کا، ایسی زندگی کا کیا بھروسہ اور کیا غم، مگر انسان ہے کہ وجود کی تبدیلیٔ صورت پر ماتم کرتا ہے، گریہ وزاری کرتا ہے، کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ہزار ایائے کے باوجود قدرت نے اپنی امانت واپس لے لی، شئی مستعار مانگ لی، لیکن جو انسان قرض لے کر واپس کرنے میں تردد محسوس کرتا ہو اسے اپنوں کے عزیز وجود کے ختم ہونے پر غم کیوں نہ ہوگا، یہ ایک فطری جھکاؤ ہے، اس کے لئے شاید وہ فطرتاً مجبور ہے، ماں باپ، بہن بھائی، دوست احباب کی جدائی کا مرحلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ کی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی فطرت سے مجبور ہوئیں اور آنحضور

کے وصال پُرملال پر انتہائی صدمے کا اظہار فرمایا۔

ثبت علی مصائب لو انہا ❊ ثبت علی الایام صرن لیالیا

یعنی مجھ پر ایسی مصیبتیں ٹوٹ پڑیں کہ اگر یہ مصیبتیں دن پر ٹوٹ پڑتیں تو وہ دن رات ہو جاتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

شیئان لو بکت الدماء علیھما ❊ عینای حتی توذنا بذھاب

لم یبلغ المعشار عن حقیھما ❊ فقد الشباب وفرقۃ الاحباب

جوانی کے جانے اور احباب کی جدائی پر اگر اتنا آنسو بہا دیا جائے کہ دونوں آنکھیں ضائع ہو جائیں تو بھی سمجھو کہ ان کے حقوق کا دسواں حصہ بھی ادا نہیں ہوا۔

معلوم ہوا یہ مرحلہ اتنا کٹھن ہے کہ نہ صبر کی تلقین آسان ہے نہ نوحہ و ماتم کی تائید، لیکن چونکہ مرحوم کا مسلسل غم موجود کو بھی وجود سے محروم کر سکتا ہے، زندگی خطرات مول لے سکتی ہے، اس لئے تلقین صبر اور صبر سے کام لینا ہی دانائی، دین ہے، اسلام ہے، جس پر عمل ہر انسان خصوصاً ہر مسلمان کا فرض ہے۔

مرحوم شاہ صاحب جیسی یگانۂ روزگار ہستی کا حادثۂ فاجعہ کوئی معمولی بات نہیں، مگر صبر کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں، اس لئے میں شاہ صاحب کے پسماندگان کو صبر ہی کی تلقین کروں گا، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں جلد صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) اور شاہ صاحب مرحوم کے صاجزادے شاہ صاحب کی زندہ یادگار ثابت ہوں جس طرح شاہ صاحب امام العصر علامہ انور شاہ (اپنے والد محترم) کی زندگی بھر زندہ یادگار رہے، اور شاہ صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی سراپا جد و جہد کریں ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو ❊ پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو

شاہ صاحب مرحوم اپنے والد محترم کی طرح خداداد صلاحیتوں کے مالک، ذہانت و طباعی کے سراپا پیکر، ادب و صحافت کے کامل آفتاب و ماہتاب ہونے کے باوجود انتہائی سادہ، متحمل مزاج اور استقلال و عزم کے کوہِ گراں تھے، فرائض کے انجام دینے میں اپنی مثال آپ تھے، جس وقت وہ رسالہ دارالعلوم کے ایڈیٹر تھے میں سمجھتا ہوں کہ ہفتہ میں دو خط میرے پاس ضرور تحریر فرماتے کہ "رسالہ دارالعلوم کا خیال رکھو، خریدار مہیا کر کے بھیجتے رہو" "دارالعلوم بڑے خسارہ میں چل رہا ہے"۔ اس طرح کے خطوط جانے کتنے متعلقین و منتسبین کو لکھتے اور بھیجتے رہے ہوں گے، وہ ایک خط میں تحریر فرمایا، "تم کچھ دنوں کے لئے

موقع نکال کر دارالعلوم چلے آؤ اور "علماء دیوبند اور علم حدیث" کے موضوع پر ایک جامع کتاب لکھ ڈالو، ابھی اس موضوع پر کوئی کام نہیں ہو سکا ہے جو بہت ضروری ہے، اس کتاب کو انشاءاللہ دارالعلوم ضرور شائع کر دے گا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب مرحوم کو رسالہ دارالعلوم اور خود دارالعلوم کا کتنا خیال تھا، علماء دیوبند اور ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کو اجاگر کرنے کی کتنی فکر تھی، وہ دارالعلوم کے مفاد میں کیا ذہن رکھتے تھے اور کس ڈھنگ سے سوچتے تھے اور کیا کیا قابل لحاظ مقاصد اور پروگرام ان کے ذہن میں پرورش پا رہے تھے جو کسی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔

میرا ایک مضمون "افکار و اخبار" کے مستقل عنوان سے ایک مدت تک مسلسل "دارالعلوم" میں شائع ہوتا رہا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت کامیاب رہا اور بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور پڑھا گیا، یہ سلسلہ بھی شاہ صاحب کے حکم پر شروع ہوا تھا عنوان بھی انھی کا تجویز کردہ تھا،

غرض شاہ صاحب اپنے متعلقین پر کتنے شفیق اور ہمدرد تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے وہ دل سے چاہتے تھے کہ دارالعلوم کے ہونہار فضلاء میدان تحریر میں نکلیں اور ملک کے عظیم فنکار ثابت ہوں اس طرح کے اوصاف آج کل ناپید سے نظر آ رہے ہیں۔

ابھی ۱۶ نومبر کو دیوبند گیا ہوا تھا، شاہ صاحب کی علالت سنکر فی الفور حاضر خدمت ہوا، یوں حاضری کا ارادہ پہلے سے تھا، وہاں جا کر دیکھا تو وہ بالکل صاحب فراش تھے، صورت بیں حالت میپرس والا معاملہ تھا، میں چپکے سے بیٹھ گیا انھوں نے ایک ہلکی آواز میں دریافت کیا، کون ہے بھائی نسیم اختر نے کہا، صادق علی بستوی۔ فرمایا: بھائی ماہنامہ طیب کا خیال رکھنا، اس کی سرپرستی کرتے رہنا۔ ــــ فرائض کی انجام دہی کی اس سے بہتر مثال اور کیا، کہاں سے مل سکتی ہے۔

غرضیکہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی وفات حسرت آیات دنیائے ادب و تحریر کیلئے ایک بڑا سانحہ ہے، میدان صحافت کی وہ جگہ خالی ہوئی ہے جو کبھی پر نہیں ہو سکتی، بقول بھائی نسیم اختر یہ واقعہ ہے کہ دیوبند کی ادبی و قلمی راہیں ہمیشہ کیلئے ویران و سنسان ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین)

مالکِ کل تجھ پہ آسانی کرے ؛؛ حشر تک تیری نگہبانی کرے

ادیب لبیب

علامہ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

مولانا عطاء الرحمن القاسمی مدیر ایلیٹ نئی دہلی

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

میانہ قد و قامت،

متناسب الاعضاء جسم، گندمی رنگ،

کشادہ پیشانی، اس پر فکر و دانش کی غیر مرئی سلوٹیں، سر پر بال والی کشمیری ٹوپی، جو آبائی وطن کی علامت و نشان، چہرہ پر متانت و سنجیدگی کے ساتھ عمر رفتہ کے نشیب و فراز، روشن و متفکر آنکھیں ان میں دار العلوم کی علمی و سیاسی شخصیتوں کی کہانیاں، موٹے موٹے لبوں پر بے ترتیب کتری ہوئی مونچھیں جس میں غمگین مسکراہٹ، خود ساختہ شرعی سفید ڈاڑھی، خاکی رنگ کی شیروانی، شیروانی کی جیب میں کئی فاؤنٹن پین اور سیاہ و سفید کاغذ۔

حق گو، خورد نواز، دوست پرست، تکلفات سے ناواقف، خود نمائی و خود بینی کے تازہ بتازہ فنکارانہ فلسفوں سے ناآشنا، خلوص و محبت کی جیتی جاگتی تصویر، صورۃً مرثیہ گو حقیقتاً باغ و بہار، — علامہ کشمیریؒ کا لختِ جگر، مولانا عثمانیؒ کا نورِ نظر، مولانا سندھیؒ کے میکدہ کا محروم،

ع میکدہ کا محروم بھی محروم نہیں۔

بلا کا فقرہ باز، دیوانِ صحافت کا بے باک و بے لوث بزرگ صحافی، بے شمار لطیفوں کا بلا شرکت غیرے خالق و موجد، — اس قلمی خاکے میں جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ علمی ادبی دنیا کی محبوب و قد آور شخصیت "مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر" کی ہے۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی عبقری شخصیت علمی و ادبی حلقہ میں محتاجِ تعارف و تعریف نہیں، عصرِ حاضر کا شاید ہی کوئی ہند و پاک میں محروم القسمت پڑھا لکھا آدمی ہو جو شاہ جی کے اداریے

مضامین، تحقیقی دینی مقالوں سے ناآشنا ہو۔ عادل صدیقی صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ:

"ایک اندازے کے مطابق انھوں نے اپنی مدت العمر میں تقریباً ساڑھے چار ہزار مضامین مختلف ادبی، دینی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھے، تقریباً ۲۳ برس سے دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ رسالہ "دارالعلوم" کے ایڈیٹر رہے ان کا زمانۂ ادارت اس ماہنامہ کی زندگی کا زریں دور سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک بالغ نظر صحافی اور نہایت ذکی اور ذہین قلمکار تھے، دیوبند سے شائع ہونے والے اخبار استقلال، ماہنامہ ہادی، ماہنامہ خالد کے ایڈیٹر رہے اس طرح انھوں نے سات یا آٹھ مختلف رسائل اور اخبارات کی ادارت سنبھالی۔"

ایک دفعہ شاہ جی نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ میاں عطاء الرحمن میں سات آٹھ جرائد و مجلات کا مدیر رہ چکا ہوں اب کسی جریدہ کے مدیر ہونے کا شوق نہیں رہا۔

شاہ جی ذکی الحس، سریع الفہم، قوی الحافظہ اور وسیع المطالعہ وسیع النظر بزرگ تھے، موصوف ہر فن و علم کے متعلق نہایت بے تکلفی اور بصیرت کے ساتھ گفتگو فرماتے۔

اگر کسی مجلس میں شعر و شاعری کا ذکر آجاتا تو عربی، فارسی اور اردو کے پچاسوں منتخب اشعار سنا دیتے اور اس کے ساتھ تنقید و تحسین بھی کرتے جاتے، کسی خاص موضوع سے متعلق کتابوں کا ذکر آجاتا بیسیوں مطبوعہ اور مخطوطہ کتابوں کا نام بتا دیتے، اور ساتھ ہی ساتھ مصنف کا تعارف اور کتاب کے محاسن و عیوب پر فاضلانہ و محققانہ روشنی بھی ڈالتے جاتے تھے، اہل مجلس ان کی حیرت انگیز یادداشت پر ششدر و حیران رہ جاتے، کوئی بندۂ خدا ان تنقیدوں اور تبصروں کو قلمبند کرلیتا تو کتاب مذکور کے لئے اچھا خاصہ "مقدمہ" بن جاتا۔

شاہ جی نے ایک مجلس میں فرمایا تھا۔ ارے میاں میں اپنی بے ترتیبی اور لاپرواہی کی وجہ سے اپنے بے شمار مضامین ضائع کرچکا ہوں، واقعی شاہ جی کے بے شمار مضامین و مقالے معمولی بے توجہی کی وجہ سے شہید ہوگئے ہیں جس کا شاہ جی کو احساس ضرور ہوا مگر رنج والم نہ ہوا، لیکن ان کے نیازمندوں کو تا زندگی غم و ملال ہوتا ہی رہے گا۔

موصوف کی مشہور تصانیف "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ"، "سفینۂ وطن کے ناخدا"، "متفرقات" اور

• حیاتِ انورؒ ہیں، یہ کتابیں کیا ہیں، ان کے ذاتی مشاہدات، تجربات اور احساسات کے ترجمان اور ان کی مختلف الجہات شخصیت کی یادگار ہیں۔

شاہ جی صحیح العقیدہ اور دیوبندی الفکر ہونے کے ساتھ ہر قسم کی جماعتی عصبیت اور گروہی تنگ نظری سے بڑی حد تک پاک تھے، آپ کے مخلصانہ تعلقات و گہرے روابط ہر مکتب فکر کے افراد سے یکساں طور پر تھے، مثلاً شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مفکر ملت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مفسر قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خان، مولانا غلام رسول مہر مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، علی محمد شیر میوات، جگر مراد آبادی، احسان دانش، سیماب اکبر آبادی، روش صدیقی، مولانا مظہر علی اظہر، شیخ عبداللہ کشمیری، غلام محمد صادق ـــــ ان بین الاقوامی اور شہرۂ آفاق شخصیتوں سے گہرے روابط و مخلصانہ و دیرینہ تعلقات تا زندگی قائم رہے، ان کے متعلق یہ کہنا زیادہ حقیقت و صداقت پر مبنی ہوگا کہ شاہ جی انسانیت کے پرستار اور انسان دوست تھے۔

شاہ جی اصلاحی انداز کے بزرگ نہ تھے، اگر موصوف "کان (بوہ صالحاً" کی بنیاد پر اپنی زندگی کے قلعہ کی تعمیر شروع کرنا چاہتے تو بہت سے "اجتماعی خلافت یافتہ" بزرگوں کو شکست دے جاتے۔ لیکن ان کی غیور طبیعت اور قلندری مزاج نے مخلوقِ خدا کو فریب و دھوکا دینا اور سادہ لوح مسلمانوں کے گھر اجاڑ کر اپنی بلڈنگ چمکانا گوارہ نہیں کیا، میرے نزدیک شاہ جی کی عظمت کی دلیل ان کی بے ریا زندگی تھی، ان کے ظاہر و باطن میں قائدانہ تضاد نہ تھا، ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند تھی جس کا کوئی باب پردۂ راز میں نہیں تھا ـــــ وہ مردِ قلندر مخلوقِ خدا سے نہیں خالقِ کائنات سے ہر دم خوفزدہ رہتا تھا، ع

قدر پہچانی نہیں اس گوہر دانا کی

شاہ جی صورتاً ظریف الطبع اور لطیفہ گو نہیں بلکہ مرثیہ گو معلوم پڑتے تھے، لیکن ان کی گفتگو نہایت دلچسپ اور عالمانہ ہوتی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب ان کے دلچسپ فقروں اور لطیفوں کی مثال دی جاتی تھی اور جو غریب

ان کے فقروں اور لطیفوں کا نشان بنتا تھا اسے ہنستے بنتی نہ روتے۔

ہم خیال وہم مذاق بے تکلف دوستوں کی محفل ہوئی، کوئی ان کی پسند کی بحث چھڑ جاتی پھر دیکھئے " انداز گل افشانی تقریر"

شاہ جی آخر میں بالکل بجھ چکے تھے، انقلابِ زمانہ نے دل مرجھا دیا تھا، احساس تنہائی بڑھ گیا تھا، المختصر دیس ہی میں پردیسی اور وطن ہی میں غریب الدیار ہو کر رہ گئے تھے، کبھی کبھی تنہائیوں اور خلوت کی صحبتوں میں ان کے دل ودماغ کے داغ کہن نمایاں ہوتے، خود بھی آبدیدہ ہو جاتے اور دوسروں کو بھی آبدیدہ کرتے، لیکن بے بس تھے، مجبور تھے، شکست خوردہ تھے اور زندگی ہار چکے تھے

راقم الحروف نے پہلی دفعہ شاہ جی کو دفتر رسالہ دار العلوم میں دیکھا، دوسری دفعہ کہاں دیکھا ان سے کیسے قریب ہو گیا یاد نہیں پڑتا، راقم الحروف دار العلوم کی رسمی تعلیم سے فارغ ہو کر جامعہ رحیمیہ (مرکز شاہ ولی اللہ دہلوی) میں تدریسی خدمات انجام دینے لگا تو شاہ جی کو اور قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، موصوف آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر دہلی تشریف لاتے، جامعہ رحیمیہ میں قیام فرماتے اور محترم علی محمد شیر میوات صاحب مدظلہٗ کے خصوصی مہمان ہوتے، شاہ جی شیر میوات صاحب کی بلند حوصلگی و عالی ظرفی وروایتی مہمان نوازی کی بڑی تعریف فرماتے، اور ان کی قومی وملی خدمات کی بڑی قدر کرتے، مولانا اخلاق حسین قاسمی کے جامعہ رحیمیہ میں تدریس اور اہتمام کے تعلق پر خوشی کا اظہار کرتے تھے اور یہ فرماتے کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے ولی اللٰہی خاندان کی قرآنی خدمات پر جو قابل قدر کام کیا ہے اس کی وجہ سے یہ اس جگہ اعزاز کے مستحق تھے۔

آخر دفعہ، ستمبر ۱۹۵۳ء میں آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر دہلی تشریف لائے، غالباً سیرتِ نبوی یا فلسفۂ قرآنی پر تقریر ٹیپ کرائی تھی، کچھ دنوں کے بعد راقم الحروف کو کسی اہم ضرورت سے دیوبند جانا ہوا تو آستانۂ انوری پر قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا۔

شاہ جی حسب عادت بڑے خلوص ومحبت سے ملے اور پرتکلف ناشتہ کرایا، جب چلنے لگا تو فرمایا آل انڈیا ریڈیو سے دعوت نامہ آیا ہے جلد ہی آنے والا ہوں میں برابر انتظار ہی میں تھا مگر افسوس ان کو نہ آنا تھا نہ آسکے۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد مولانا محمد اسلام قاسمی مدیر الثقافہ نے بتایا کہ شاہ جی صاحب فراش ہو چکے ہیں، یہ المناک خبر سنکر بڑا قلق ہوا۔

ملازمت بھی قید فرنگ سے کم نہیں ۔ مدرسہ سے کسی طرح چھٹی لے کر دیوبند حاضر ہوا تو شاہ جی، شاہ جی نہ تھے ۔ ان کی حالتِ زار دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے

۲۹ ر نومبر ۸۵ء کو قومی آواز میں شاہ جی کی تصویر کے ساتھ یہ المناک خبر نظر سے گذری کہ شاہ جی ۲۷ ر نومبر ۸۵ء کو راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے اور ہزاروں عقیدتمندوں اور نیازمندوں کو تڑپتے بلکتے ہوئے چھوڑ کر قبر کے گوشۂ تنہائی میں قیامت کی نیند سو گئے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

چرخِ دیوبند کا درخشندہ ستارہ

مولانا محمد اعجاز عرفی

بھلا اس حقیقت سے انکار کی جرأت کون کرسکتا ہے کہ انسان قدرت کا ایک حسین شاہکار ہے اور گلستانِ قدرت کا سب سے خوبصورت پھول، مگر جس طرح چمن میں خار دار شاخوں پر گلاب کے پھول کی خوشبو سے پورا چمن معطر آگیں ہوتا ہے اور ہر ذرّہ مست و سرشار، ٹھیک اسی طرح دنیائے رنگ و بو کے شاداب شبستاں میں بھی صبح ازل سے کچھ ایسے پھول کھلتے آئے ہیں جس کے اندر ظاہری خوشبو اس قدر رچی بسی ہوتی ہے جس سے ہمیشہ چمنستانِ انسانیت معطر رہی ہے۔ اور مولانا سید ازھر شاہ قیصر کی شخصیت بھی انہی پھولوں میں ایک شگفتہ شاداب پھول کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کی خوشبو نصف صدی سے پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

آپ فہم و فراست کا مجسمہ، ذکاوت و ذہانت کا پیکر، اردو کے مایۂ ناز ادیب اور قابلِ فخر مضمون نگار، ہندوستان کے لائق صد ستائش مصنف، اور ازہر الہند دار العلوم دیوبند کے علمی و دینی جریدہ کے کامیاب ایڈیٹر تھے، ان کی ادبی نگارشات ہوں یا علمی شہ پارے، تنقیدی مضامین ہوں یا دینی مقالات، ان میں آفتاب کی جلالت، ماہتاب کی صباحت، سبزہ زاروں کی تراوٹ، آبشاروں کا نغمہ، جھرنوں کا ترنم، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، پہاڑوں کا وقار، ستاروں کی تابناکی، تاج محل کا حسن، قطب مینار کی بلندی، لال قلعہ کا استحکام، یہ ساری خصوصیات اس حسین تناسب کے ساتھ ملیں گی کہ آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ ان مضامین و شہ پاروں کا مطالعہ ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ عرش کی سربلندیوں سے فرش کی شادابیوں کا نظارہ بھی ہو رہا ہے، خاص کر آپ کے ادبی مضامین تو رعنائیوں کا مظہر اور دلفریبیوں کا مرقع ہیں، جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے مطالعہ سے مزاج میں کیف و سرور دل میں

مسرت اور خوشی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں، انسان حزن وملال، غم واندوہ سے کوسوں دور نظر آتا ہے فضا رنگ ونور میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ہر ذرہ رقصاں دکھائی دیتا ہے، کائنات جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

آپ نے دسمبر ۱۹۲۰ء میں عالم امکان کا پہلا جلوہ دیکھا، ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی حفظ قرآن کے بعد اپنے ماموں مولانا حکیم محفوظ علی صاحب سے فارسی پڑھی، پھر دارالعلوم دیوبند میں عربی اور دینیات کی تعلیم کا آغاز ہوا، ڈابھیل اپنے والد ماجد حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح کی معیت میں تشریف لے گئے اور وہیں پر درس نظامی کے درمیانی درجہ تک کتابیں پڑھیں مگر چند وجوہات کی بنا پر عربی دینی تعلیم کی تکمیل نہ ہو سکی، لیکن اسکے باوجود دینیات اسلامیات پر وسیع نظر رکھتے تھے یہ کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ معلومات کا نتیجہ تھا، بہر حال آپ کی زندگی کی بارہ بہاریں ہی گذری تھیں کہ آپ کی یتیمی کا شہرہ مشرق سے مغرب کی وسعتوں تک جا پہنچا یعنی آپ کے عظیم والد دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، عالم اسلامی کی عدیم النظیر شخصیت، دنیا کا فقید المثال محدث اور سرزمین ہند کا چلتا پھرتا، جلیتا جاگتا کتب خانہ علامہ انور شاہ کشمیری رح حیات مستعار کے قیمتی لمحات کو علم وفن کی لازوال وادیوں میں بسر کر کے معبود برحق سے جا ملے۔ ایسی ہستیاں جنھیں قدرت اپنے دستِ کرم سے بناتی اور سنوارتی ہے، ان کی وفات کسی ایک شخص کا ماتم نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک سماج ایک جماعت ایک طبقہ کا ماتم ہے، تو بے شک حضرت شاہ صاحب بھی انھی ہستیوں میں سے ایک ہیں جو صدیوں کے بعد افق دنیا پر نمودار ہوتی ہیں، مگر محض حضرت شاہ صاحبؒ کا نام ایسی ہستیوں کی فہرست میں درخشاں ہی نظر نہیں آتا بلکہ ان کی انفرادیت کی تابانی اور درخشانی بھی صاف اور نمایاں دکھائی دیتی ہے، کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ جہاں فانی ہے کوئی چیز لافانی نہیں

پھر بھی اس دنیا میں انور شاہ کا ثانی نہیں (شورش کاشمیری)

بہر کیف حضرت شاہ صاحب کی وفات کی خبر آندھی کی طرح ملک میں پھیل گئی، ہر طرف سے آنے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا، ان آنے والوں میں ایک مولانا ظفر علی خان مرحوم بھی تھے، ان کی آمد پر دیوبند ہی کی جامع مسجد میں ایک استقبالیہ جلسہ کا انعقاد ہوا، جس میں مولانا ازہر شاہ قیصر

نے اپنے پورے بچپن کے باوجود فوری طور پر ایک سپاس نامہ لکھکر مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی خدمت میں پیش کیا تو مولانا مرحوم سپاسنامہ سنکر انگشت بدنداں ہو گئے اور بلا اختیار یہ جملے ان کی زبان سے موتیوں کی طرح بکھرنے لگے کہ اس کم عمری میں ایسی تحریر آج تک میری نظر سے نہیں گذری پھر اس سپاسنامے کو زمیندار کے پہلے صفحہ پر شائع کیا اور اسکے ساتھ ہی ایک تعریفی نوٹ بھی مولانا ازہر شاہ قیصر پر لکھا، اس سنہرے واقعہ سے مولانا ازہر شاہ قیصر کی انشاپردازی کا اندازہ بحسن وخوبی لگایا جاسکتا ہے جنھوں نے کم سنی ہی میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم جیسے بے مثال صحافی سے خراج تحسین وصول کیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے مشہور ومعروف شاعر جناب احسان دانش نے ماہنامہ الرشید کے دارالعلوم دیوبند نمبر میں آپ کو ان وقیع کلمات سے یاد کیا ہے کہ ،،مولانا ازہر شاہ قیصر علامہ انور شاہ کشمیری کے بڑے صاحبزادے ہیں، نظم ونثر پر دسترس ہے، اور دارالعلوم دیوبند کے رسالہ "دارالعلوم،، کو مرتب کرتے ہیں، اس سے ان کے قلم کے جولانی اور فکر کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بحیثیتِ انسان خوش خلق، حلیم، محنتی اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ وہ بھی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی طرح اپنا مقام پیدا کرلیں گے،، اس کے علاوہ بہت سے اربابِ کمال نے آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے قلت صفحات مانع ہیں کہ ان کو پیش کیا جائے، مگر یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ناقدری اور کم ذوقی نے سیکڑوں صاحبِ علم وفضل، اربابِ زبان وبیان کے چہروں پر گمنامی کے دبیز اور تہہ بہ تہہ پردے ڈال دیئے ہیں، میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مولانا ازہر شاہ قیصر کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا، جب تک یہ صنم خانۂ ہستی قائم ہے اس وقت تک آپ کے نام کی گونج بھی سنائی دیتی رہے گی۔

بہرکیف آپ نے وقت کی ہر ضرورت پر قلم اٹھایا بے شمار مضامین لکھے جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہو کر ہزاروں تک پہنچتی ہے، اور ایسے مشہور ومعروف رسالے جن میں صفِ اول کے لکھنے والوں کی تخلیقات ہوتی تھیں مثلاً نیرنگِ خیال لاہور، ساقی دہلی، سہاگ لاہور، حور لاہور، اخبار زمیندار لاہور، انقلاب لاہور، شہباز لاہور، اس کے علاوہ بہت سے رسالے آپ کے مضامین سے ایک عرصہ تک مزین ہوتے رہے، اور ان رسالوں کے ...نیات

پر آپ کے بے شمار ادبی شہ پارے پھیلے ہوئے ہیں، دینی و علمی جریدوں میں قاسم العلوم دیوبند
پیام الاسلام جالندھر، شمس الاسلام پنجاب، نور جالندھر، اور اس کے علاوہ بہت سے
جریدوں میں آپ کی تخلیقات بکھری ہوئی ہیں، متعدد رسائل بھی آپ کی ادارت میں نکلتے رہے
ہیں، جن میں اخبار انور دیوبند، صداقت سہارنپور، ہادی دیوبند، وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں،
جن کے آپ ایڈیٹر رہے ہیں اور اپنے قلم کی جولانیوں سے کتنے گم کردہ منزل کو منزل آشنا
کیا، آپ کے وہ مضامین جو مشہور شخصیات پر لکھے ہوئے ہیں ان سے بہت سے لوگوں کو زندگی
ملی اور ان مضامین سے لاکھوں افراد نے استفادہ کیا، دین بیزار دین پرست ہو گئے۔

۴۹ء سے دار العلوم دیوبند کے علمی، دینی شاہکار دار العلوم کی ادارت بھی آپ ہی کے
ذمہ رہی، آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے اور مرتب بھی جن میں اذانِ بلال لاہور سے شائع
ہو کر ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی جواب نایاب ہے، صدیقِ اکبر دیوبند سے شائع ہوئی جو کمیاب ہے،
علامہ انور شاہ اور قادیانیت اور یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ، جو شخصیات پر لکھے ہوئے مقالات
کا مجموعہ ہے جس میں آپ کا قلم اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گری کر رہا ہے، جس کے مطالعہ
سے آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ ہستیاں چل رہی ہیں، بکھر رہی ہیں، آ رہی ہیں جا رہی ہیں اور
یہ ہی انشا پردازی کا کمال ہے۔

شاہ منزل دیوبند، صرف ایک مکان کا نام ہی نہیں ہے بلکہ وہ طلبائے عزیز اور تشنگان علم وادب کے لئے ایک درسگاہ اور فیض کا بحر ذخار بھی ہے، اس کے مکین خواہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں یا زندہ ہیں اپنا ایک مقام ایک درجہ ایک شہرت وعظمت و روحانیت رکھتے ہیں، میرا شاہ منزل سے تعلق اگر سوچوں اور یاد کروں تو بچپن ہی سے ہے، اور وہ اس طرح کہ میرے بچپن (غالباً ۳۸-۱۹۳۹ء) میں مدرسہ نوریہ اشرفیہ حسن پور لوہاری مظفر نگر میں لدھیانہ سے بچوں کا ایک رسالہ آیا کرتا تھا، اس رسالہ میں ایک صاحب مولانا ازہر شاہ قیصر بچوں کے لئے کچھ لکھا کرتے تھے، جس ماہ کے رسالے میں ان کا کوئی مضمون نہیں ہوتا تھا تو ہم سبھی طالب علم ان کی کمی محسوس کیا کرتے تھے، اور وہ رسالہ (یعنی وہ شمارہ) کچھ پھیکا پھیکا رہتا تھا، یہ بات اس وقت کی ہے جب میں ابتدائی دینی کتب اور قرآن پاک حفظ کر رہا تھا، اس وقت سے میں شاہ منزل کو تو نہیں البتہ مولانا ازہر شاہ قیصر صاحب کو جانتا ہوں، اور ان کے نام سے نہ جانے کیوں ایک والہانہ عقیدت اور محبت چلی آرہی ہے ان سے یہی میرا بچپن کا غائبانہ تعارف تھا۔

پھر اس کے بعد غالباً ۴۴-۱۹۴۵ء میں مزنگ (لاہور) میں حضرت احسان دانش صاحب مرحوم کے مکان پر دو صاحب دیوبند سے آئے، یہ دونوں بھائی مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر اور مولانا انظر شاہ صاحب تھے دوپہر کے وقت دیر تک باتیں کرتے رہے، رخصت کرنے کے لئے انار کلی تک آیا، یہاں آکر دہی کی لسی پی اور میں مزنگ لوٹ آیا، یہ بالمشافہ شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی، لیکن میں ان دنوں شاعر تھا نہ ادیب (اور نہ میں آج اس قسم کا دعویٰ کرتا ہوں) مکتبہ دانش میں رہ کر جناب محمد اسحاق خاں شور احسانی سے کتابت سیکھ رہا تھا، اور کچھ کتب خانہ میں کام بھی کرتا تھا، یہیں سے شاہ صاحب سے مراسلت کا نیازمندانہ سلسلہ جاری ہوا اور کبھی

کبھی رسالہ دارالعلوم کے دفتر میں جا کر مزاج پرسی کی، اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے پلٹ آتا، پھر اس کے بعد شاہ منزل تک بھی رسائی کا شرف حاصل ہوا، اور یہ بات مجھ ایسے طالب علم کے لئے باعث فخر تھی، اب میں خود کو شاہ منزل کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا، اب مجھے شاہ صاحب اندر ہی بلا لیا کرتے تھے، اگر کھانے کا وقت ہوا تو کھانا ضرور کھلایا جاتا، یا پھر چائے تو ہر حال میں پلائی جاتی، کبھی کوئی کتاب بھی عنایت کی جاتی۔

۲۵ر نومبر ۸۵ء کو میری بائیں آنکھ کا آپریشن ڈاکٹر شراف چیریٹی ہسپتال دہلی میں ہوا اخبارات اور لکھنے پڑھنے کی سخت ممانعت تھی، جناب سرور تونسوی ایڈیٹر شان ہند حسب معمول شب میں آئے اور آتے ہی یہ منحوس خبر سنائی، لو بھئی تمہارے ازہر شاہ قیصر بھی خدا کو پیارے ہو گئے اس کے بعد تفصیل سے خبر سنائی، ظاہر ہے کہ اس خبر سے اس وقت مجھ پر کیا گذری اور کیا بیتی ہو گی اور اس عالم بیچارگی میں میرا کیا عالم اور کیا حالت ہوئی ہو گی

شاہ صاحب — مر گئے — شاہ صاحب بھی گئے — شاہ صاحب تو کئی ماہ قبل اس وقت مر چکے تھے جب میں ان کو دیکھنے کے لئے مظفر نگر کے ایک ہسپتال میں آیا کرتا تھا اور شاہ صاحب موت و زلیست کی کشمکش کا شکار تھے، کبھی امید و بیم کے عالم میں تھے، سبھی ان کی حالت دیکھ کر مایوس تھے، چپ تھے، ہر کوئی آکر سرگوشیاں کرتا تھا، شاہ صاحب اس وقت کیسے بچ گئے، اتنے عرصہ کیسے زندہ رہے —؟

جب میں پہلی بار ٹاؤن ہال کے سامنے تلاش کرتا ہوا ایک ہسپتال میں پہنچا تو شاہ صاحب کو دیکھتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی نظر آئی اور میں نے تو اس وقت صبر کر لیا تھا دوسری بار آیا تو مجھے دیکھ کر ہفت روزہ قومی آواز کی طرف اشارہ کیا، اس میں شاہ صاحب کے ادبی لطائف تھے، اور میری کتاب "اسے کیا کہئے" سے چند شعراء کے لطائف دیئے گئے تھے، اس دن کچھ تسلی ہوئی کہ شاہ صاحب اس خطرہ سے بچ گئے، تیسری بار پھر حاضری دی تو چائے بھی پلوائی اور حسب عادت ذرا تفریحاً اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کیں، مجھے شبہ ہوا کہ فالج کا اثر تو نہیں ہے، یہ میرا وہم تھا ایسا نہیں تھا، پھر آیا تو موجود نہیں تھے، دریافت کرنے پر بتلایا گیا کہ دیوبند چلے گئے ہیں، گھر گیا تو اب وہ پہلی سی حالت نہیں تھی، اب کچھ بولنے بھی لگے تھے، کبھی

کبھی تیور بھی بدلتے اور بگڑتے بھی تھے، میں ان کو ہنسانے کی کوشش بھی کرتا رہا لیکن آج وہ باغ و بہاراں شاہ صاحب بجھے بجھے سے تھے، بیحد کمزوری تھی بہرحال جب پلٹا تو خوش تھا کہ چلو اچھا ہوا اس بار شاہ صاحب بچ نکلے۔

شاہ صاحب کیا تھے اور کیا نہیں تھے، شاہ صاحب کسی شخصیت کا نام تھا، شاہ صاحب کس پایہ کے مصنف، مؤرخ، باکمال ادیب، لاجواب شاعر، مستند صحافی، میزبان مربّی اور معلم علم وادب تھے، ان کی خوبیاں کس طرح گنائی جائیں، ان کے بارے میں کیا لکھا جائے، وہ علم وادب کا تابناک اور درخشاں آفتاب تھے، اب سورج کے سامنے کسی چراغ اور شمع کی کیا حقیقت اور حیثیت، وہ علم کا ایسا بے پایاں سمندر تھے کہ جس کی گہرائی کا کوئی پتہ ہی نہیں تھا، ایسے سمندر کے سامنے دریا اور ندی کی حقیقت معلوم، وہ ایسے صحافی تھے کہ جن کو مولانا ظفر علی خاں روزنامہ زمیندار لاہور میں جگہ دیتے تھے، حالانکہ یہ اخبار ملک کے چند مشاہیر اہل قلم کے لئے یا خود مولانا ظفر علی خاں کے لئے وقف تھا، اگر اس اخبار میں کسی کا نام بھی چھپ جاتا تو اسے بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا اور شاہ صاحب اپنے ابتدائی دور میں زمیندار میں برابر چھپتے تھے، ملک کے کسی بھی عظیم اخبار اور مؤقر رسالہ میں ان کے مضامین قسط وار چھپتے اور ان کی پذیرائی ہوتی، ان کے مضامین کیلئے انتظار کیا جاتا۔ اسے چھوڑیئے کہ اس محنت کا صلہ کیا عطا کیا گیا، یہ یہاں کا دستور ہی کہاں ہے، شاہ صاحب تو یوں بھی ایسی باتوں سے بیزار تھے، ان کو طمع زر تھی نہ حرص دولت، ان چیزوں سے زندگی بھر بے نیاز رہے، بڑے قلندر اور درویش مزاج تھے کبھی دب کر اور گر کر بات نہیں کی۔

جب شاعری کی طرف توجہ فرماتے تو خوب کہتے لیکن تفریحاً جب کسی پر تنقید کرتے تو مزہ آجاتا، بہترین نقاد بھی تھے ان کے پسندیدہ اور محبوب شعراء فانی وجگر، میر تقی میر، احسان دانش اور روش صدیقی تھے، کبھی کبھی ان کے بیشمار اشعار سناتے، کبھی ان شعراء کے کسی شعر پر تبصرہ اور تنقید بھی فرماتے، وہ جو بات کہتے ذرا بھی رورعایت اور نرمی نہیں کرتے اور بلا جھجک کہہ گذرتے، بڑے حق گو تھے۔

دارالعلوم کے ایڈیٹر رہے تو اس کی شان بڑھادی، اور اس میں لکھنے والوں کا ایک معتبر، مستند اور مشاہیر صاحب قلم اور باکمال حضرات کا مجمع اکٹھا کرلیا اور اس طرح اس کو بلند

پایہ رسالہ بنا کر اہل علم و ادب کے سامنے پیش کیا۔

دارالعلوم میں ایک جنگ لڑی گئی لیکن شاہ صاحب اگر چاہتے تو خوب لکھ کر کم از کم اور قلمکاروں کی طرح دولت کما لیتے مگر وہ اس جنگ سے دور رہے اور دونوں فریق کی نظر میں قابلِ احترام رہے۔

شاہ صاحب قلم کے بادشاہ تھے، وہ ہر وقت ہر عالم میں بلا تکلف قلم برداشتہ ہر موضوع پر لکھتے تھے، ان کے لکھنے کا کوئی خاص رنگ، خاص انداز اور طرز تحریر نہیں تھا، وہ ہر رنگ میں بے تکان لکھنے کے عادی تھے، یہاں تک کہ ریڈیو کے لئے بھی ان کی فرمائش پر لکھا کرتے تھے وہ ایک صاحبِ طرز اور منفرد ادیب و صحافی تھے جو منکھی طرز تحریر کے مالک تھے، آخر وقت میں اچھا ہوا چند مضامین جو اِدھر اُدھر بکھرے اور اخبارات میں چھپے ہوئے تھے کتابی صورت دے کر اردو ادب پر عظیم احسان فرمایا۔

میری کتاب تبصرے پر کچھ لکھنے کے لئے خواہش کا اظہار فرمایا، میں نے بڑے اعتماد سے مسکرا کر عرض کیا؛ شاہ صاحب! جو اردو جانتا ہے وہ حضرت کریمی الاحسانی صاحب کو ضرور کسی بھی حیثیت سے سہی ضرور جانتا ہے، پھر اب کچھ لکھانے کی ضرورت ہے نہ ایسا سہارا چاہئے۔

شاہ صاحب کبھی کبھی حوصلہ افزائی اس طرح بھی فرماتے کہ میں بے تکلف اپنے تازہ اشعار پیش کرتا تو سنتے، داد بھی دیتے کبھی کسی مصرعہ کے لئے فرماتے اس طرح کہو اب یہ معیاری ہو جائیگا ورنہ شاہ صاحب کسی شاعر سے ذرا کم ہی سنتے تھے، کبھی فرماتے اب تم کیا لکھنے لگے ہو اس طرح مت لکھو، اب کریمی کا ایک مقام ہے، میں اس ذرہ نوازی پر قہقہہ لگاتا اور اسی طرح چیخ کر کہتا جی ہاں کریمی صاحب کا ایک مقام ایک درجہ اور شہرت ہے، لیکن یہ سب آپ کی دعائیں اور کرم ہے۔

کبھی ڈانٹتے کہ اس مضمون میں تم درباری بن گئے، میں عرض کرتا کہ شاہ صاحب میں کانگریسی ہوں اس لئے الیکشن کے وقت ایسے ہی بے سرو پا باتیں اور ہنگامہ خیزی ہوا کرتی ہے، یہ سب کچھ ہنگامی باتیں ہیں، حالانکہ شاہ صاحب کسی ازم اور سیاست کے مقلد اور قائل نہیں تھے لیکن ذرا جھکاؤ حریت پسندی کی طرف ضرور تھا، اس قسم کے بے شمار مضامین اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

اس بار تمھارے تبصرے فلاں اخبار میں پڑھے، خوب تھے اور پھر دو ایک شعر بھی سنا دیتے، یہ بات مجھ ایسے طالب علم کے لئے باعثِ فخر تھی، ایک بار فرمایا: مولانا ظفر علی خاں نے "سب مزے میں ہیں" ردیف میں اشعار کہے ہیں، تم بڑا اچھا کہہ لوگے، تم کو اس رنگ اور طنز سے مناسبت ہے، کہو: میں نے عرض کیا کہاں ظفر علی خاں کی زمین اور کہاں بندۂ ناچیز، بات آئی گئی ہوئی، اس زمین میں کچھ جھک ماری اور شاہ صاحب کو سنانے کی سعادت حاصل کی، بہت خوش ہوئے، یاد پڑتا ہے کہ "دیوبند ٹائمز،، اور "دارالعلوم" میں بھی یہ اشعار شائع کئے گئے تھے، جس کا مطلع یہ ہے ؎

سرحد کے پار کی ہے خبر سب مزے میں ہیں ؛ ہم بھی تو کہہ رہے ہیں ادھر سب مزے میں ہیں

دارالعُلوم کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر خصوصی طور سے پریس گیلری کے لئے کارڈ دلایا، اور فرمایا شروع سے آخر دن تک کی تمام کارروائی نوٹ کرکے اپنے انداز سے لکھ کر مجھے دینا، میں دارالعلوم میں شائع کروں گا، یہ اعزاز میرے لئے کچھ کم نہیں تھا، چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل کی، اور یہ آنکھوں دیکھا کانوں سنا حال (کمنٹری کی صورت میں) پیش کیا، بہت خوش ہوئے اور اگلے ماہ دارالعلوم میں شائع کیا۔ شاہ صاحب اپنے نیاز مندوں، حلقۂ احباب کو اس طرح بھی بڑھاتے اور ہمت افزائی کرتے تھے۔

نہ جانے کتنے ریسرچ اسکالر شاہ صاحب سے مشورہ کرتے اور کچھ ضروری ہدایات لے کر جاتے، شاہ صاحبؒ ایک معلم بھی تھے، شاہ منزل اس بات کی گواہ ہے کہ نہ جانے کب سے اس درسگاہ میں بے شمار لاتعداد اور ان گنت طلبہ قیام کر چکے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ سب کی ہر طرح سے مدد کی جاتی ہے، شاہ صاحب بڑے فراخ دل، مخیر، مہمان نواز، کرم گستر، جاں نثار، مردم شناس تھے، شاہ صاحب سے زیادہ ان کی اہلیہ محترمہ مہمان نواز ہیں، میں نے صد سالہ اجلاس دارالعلوم کے دنوں میں ان کی بلند حوصلگی یہ دیکھی کہ شاہ منزل میں مہمانِ رسول کا ایک جمِ غفیر تھا، بالائی منزل سے نیچے تک مہمان ہی مہمان نظر آتے اور راتے پڑے تھے، اور سبھی کو ناشتہ سے لے کر کھانا تک یہیں سے ملتا تھا، یہ ایک دو دن کی بات نہیں تھی بلکہ ہفتوں یہ سلسلہ جاری رہا، شاہ صاحب نے بڑی دریا دلی اور ہمت سے یہ بارِ عظیم برداشت کیا دارالعلوم سے علٰحدگی کے بعد ان کے گھر کے اخراجات میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی بلکہ

علالت اور انتقال سے قبل دو شادیاں کیں، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی شادی ہوئی جب میں نے دعوت ولیمہ میں شرکت کی تو میں نے چپکے سے عزیزی نسیم اختر سے کہا، پورے ہی شہر کی دعوت کردی ہے کیا؟ اس پر انھوں نے مسکرا کر فرمایا، کیا کیا جائے سب چلتا ہے، میں دانستہ کھانے کا وقت گذار کر جانے لگا تو شاہ صاحب حسب عادت کھانے کے لئے اصرار کرتے میں انکار کرتا تو فرماتے، صبیحہ! کریمی کیلئے کھانا لاؤ، کریمی! اگر میں دار العلوم میں نہیں ہوں تو میں اتنا غریب بھی نہیں ہوں کہ تجھے کھانا بھی نہ کھلا سکوں، کھانا آتا، میں کھاتا شاہ صاحب اسی دوران گفتگو شروع کرتے، جب شاہ صاحب بولنے پر آتے تو پہروں بولتے اور تسلسل برقرار رکھتے۔ پان بھی اسی شدت سے کھاتے رہتے، چائے کے بھی رسیا تھے، پرہیز کے عادی نہیں تھے، لاکھ ڈاکٹر اور طبیب چند چیزوں کے لئے بتلاتے کہ شاہ صاحب یہ نہ کھایئے لیکن شاہ صاحب کبھی بھی ان کی باتوں پر عمل نہ کرتے، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طویل عرصہ سے علیل تھے، ابھی ایسی خارش میں مبتلا رہے کہ تمام رات نہیں سوتے تھے لیکن چائے بدستور جاری رہی بدپرہیزی ان کی کمزوری تھی۔

بڑے شاہ صاحب کسی کروفر اور ٹیپ ٹاپ سے نہیں رہتے تھے، بڑی سادہ زندگی گذارتے تھے، لباس میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں تھا، وہی قمیص پاجامہ، سردی کے دنوں میں شیروانی استعمال کرتے بڑے شاکر و صابر تھے۔

شاہ صاحب کی شخصیت بڑی تہہ در تہہ تھی وہ یاروں کے یار تھے، بڑے باغ و بہاراں اور محفل کی جان تھے ان کا قلم ایک روشنی کا مینار تھا اور بڑا ارفع و اعلیٰ تھا اس کی بلندی کے سامنے کتنے ہی قلمکار بونے سے نظر آتے تھے، ان کے قلم کی جولانگاہ اور پرواز فکر ہمالہ سے بھی اونچی تھی اسکے سایہ میں نہ جانے کتنے صاحب قلم دبے رہتے اور سرنگوں نظر آتے، ان پر کس جہت کس پہلو کس رخ سے لکھا جائے، اب ہم ایسے نہ جانے کتنے طالبان علم وادب ان کی کمی محسوس کرینگے اہم اور نازک مسائل سمجھنے کے لئے اب کس کے پاس جایا کریں گے، اردو ادب کیلئے یہ عظیم المیہ بڑا سانحہ ہے اب خلا کا پُر ہونا ناممکن نظر آتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس طرح ان کو خراج عقیدت پیش کروں، قلم لرزاں ہے خیالات منتشر، قوت گویائی پراگندہ، دل بے چین آنکھیں اشکبار اس عالم میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں، ایک عجیب موڑ اور عجیب مقام بے بسی مجبوری ہے خداوند کریم ان کی روح کو سکونِ ابدی اور ہم سبھی کو صبر عطا کرے۔ آمین۔

مردِ حق آگاہ

ڈاکٹر رضوانہ خاتون اعظم گڑھ

حیات و موت کی کشمکش ابتدائے آفرینش سے جاری ہے، اور جب تک دنیا باقی ہے یہ سلسلہ بھی قائم رہے گا، اس لافانی دنیا میں جو بھی آیا وہ جانے کے لئے ہی آیا، ہر شخص کو ایک نہ ایک دن موت سے ہم کنار ہونا ہے، یہی وہ سچائی ہے جس کے سبب اس جہانِ گذران میں بھی کبھی کبھی زیست کی بے ثباتی کا احساس اس قدر شدّت سے ہوتا ہے کہ بادِ نسیم کی مہک، کلیوں کی خوشبو، غنچوں کی مسکراہٹ، پھولوں کی دل آویزی، شبنم کی رعنائی اور آفتاب کی تازہ روپہلی کرنوں کی دلربائی سے بھی ڈر محسوس ہونے لگتا ہے، زندگی کے فنا کے تصور سے گمان ہوتا ہے جیسے ذہن اور روح دونوں تاریکیوں کے سمندر میں ڈوبتے چلے جا رہے ہیں، مرگِ ناگہانی، داغِ مفارقت، دائمی جدائی، کئی بار ذہن کی خلش کہہ اٹھتی ہے کہ کتنے بے رحم، کتنے بھیانک ہیں قدرت کے یہ ضابطے، جن میں دنیا جکڑی ہوئی ہے، انسان ارمانوں کی دنیا سجاتا ہے، تمناؤں کے محل تعمیر کرتا ہے، آرزوؤں کے چراغ جلاتا ہے، امیدوں کی شمعیں روشن کرتا ہے، لیکن موت کا تصور ایک سنگ گراں بن کر شعور کے آئینوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، دنیا کی بے ثباتی آئینے کے انھیں ٹکڑوں سے منعکس ہوتی ہے

بعض انسانوں کی موت سے نہ صرف ان کے دوست و احباب اور عزیز و اقارب ہی سوگوار ہوتے ہیں بلکہ ایک وسیع حلقہ ان سے متاثر ہوتا ہے، ایسی شخصیتوں کے اوجھل ہو جانے سے ایک ایسا خلاء ہو جاتا ہے جس کے پر ہونے کی دور دور تک کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مولانا سید محمد ازھر شاہ قیصر بھی ایسی ہی ایک قد آور شخصیت تھے انھوں نے دیوبندی مکتب فکر، اردو صحافت، اور انشاپردازی کے میدان میں اپنے قلم گہربار سے جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں وہ ان کے دوستوں اور رفقاء کو زندہ نقش معلوم ہوتے ہیں، یہ درست ہے کہ

عظیم اور جلیل ہستیوں کے اٹھ جانے کے بعد بھی نظام کائنات چلتا رہتا ہے، چاند اپنے وقت پر نکلتا ہے، ستارے حسب معمول چمکتے ہیں، سمندروں میں طغیانیاں آتی ہیں، دریاؤں میں تلاطم برپا ہوتے ہیں، ندیوں میں سیلاب آتے ہیں، لیکن قحط الرجال کے اس دور میں اردو دنیا سے جو ہستی بھی رخصت ہوتی ہے اس کا نعم البدل نظر نہیں آتا۔ ویسے بھی دیوبندی مکتبِ فکر پر کچھ برسوں سے پت جھڑ کا موسم محیط ہے، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مولانا محمد عثمانؒ، مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ، مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدیؒ سبھی مرحوم ہو گئے۔ ان سے کتنی محفلیں اجڑ گئیں، یہ لوگ کتنے دلوں کی دھڑکن تھے، کتنے گوشوں کی بہار تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

مولانا قیصر کی وفات سے دیوبندی مکتبِ فکر ہی سُونا نہیں ہوا اردو حلقوں کو بھی بڑی شدت سے محرومی اور لاچاری کا احساس ہوا ہے، کسی عظیم انسان کی شناخت اس کی موت کے بعد ہوتی ہے، اور اسکے اوصاف کا علم اس کے چلے جانے کے بعد ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم کو زمانے کی بہت ہی کروٹوں سے واسطہ پڑا انھیں گردشِ حالات کی وجہ سے شاہراہِ حیات کے ایسے ایسے دشوار موڑوں سے گذرنا پڑا جہاں سے کسی معمولی شخص کو گذرنے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا مگر مولانا ان تمام راستوں سے ہنستے مسکراتے اور چہچہاتے ہوئے گذر گئے۔ ان کے عزمِ راسخ کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے پر آشوب دور میں وہ وطن چھوڑ کر سرحد کے اس پار نہیں گئے، وہ پاکستان جا سکتے تھے اور وہاں کسی اچھے منصب پر فائز ہو سکتے تھے مگر انھوں نے سرزمینِ دیوبند سے ناطہ توڑنا گوارہ نہیں کیا، جہاں ان کے اسلاف کی ہڈیاں دفن ہیں، انھیں ہندوستان میں رہ کر وطن، اسلام اور اردو کی خدمت کرنی تھی انھیں اپنے ہندوستانی مسلمان بھائیوں کے مستقبل کا غم ستا رہا تھا، لہٰذا انھوں نے اپنی فراستِ ایمانی سے کام لیتے ہوئے اپنے کنبے کے ساتھ ہندوستان میں رہنے کا دلیرانہ فیصلہ کیا تاکہ وقت کا مورخ خاندانِ انوریہ پر وطن سے بیوفائی کا الزام نہ لگا سکے، آج مولانا مرحوم کی زندگی میری نگاہوں کے سامنے فلم کی تصویروں کی طرح متحرک ہے، ان کی یادوں کے زخم ہرے ہو رہے ہیں کانپتے ہاتھوں کی لرزتی انگلیوں سے ان یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر سے میری پہلی ملاقات دارالعلوم کے جشنِ صد سالہ کے موقعہ پر

ہوئی جس میں انھوں نے مجھے مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا تھا اور میرے لئے VIP کا پاس جاری کیا تھا، تقریبات کے آغاز سے ایک روز قبل ہی میں دیوبند پہونچ گیا تھا، جشن کے انتظامات کی کئی ذمہ داریاں مولانا کے سپرد تھیں اور وہ بیحد مصروف تھے، انھوں نے بتایا کہ مہمانوں کی تعداد توقع سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے اور ان کے قیام کا جو بھی انتظام کیا گیا تھا اس میں دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں، شب و روز کی کوشش کے باوجود ان کی رہائش کا مناسب انتظام ہوتا نظر نہیں آتا، سوچ رہا ہوں کہ آپ جیسے مہمانوں کو کہاں ٹھہراؤں، میں نے کہا مولانا آپ میری فکر نہ کریں میں بھیڑ بھاڑ کو دیکھتے ہوئے مظفر نگر کے ایک ہوٹل میں اپنے رہنے کا بندوبست کر آیا ہوں، دیوبند پہونچنے کے لئے روزانہ صبح و شام بس کا سفر کرنا پڑے گا، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

جشن صد سالہ کے دوران مولانا قیصر سے کئی بار سامنا ہوا، لیکن رسمی جملوں سے زیادہ بات چیت کی نوبت نہیں آئی، تقریبات کے اختتام پر جب میں شاہ منزل میں حاضر ہوا تو وہ آرام فرما رہے تھے کیونکہ جشن کے انتظامات نے انھیں بہت تھکا دیا تھا۔ اردو کے ساتھ ساتھ مجھے صحافت سے ہمیشہ گہرا لگاؤ رہا ہے اور مولانا تاریخ ساز صحافی تھے لہذا اس موضوع پر ان سے بات ہونا قدرتی تھی، مولانا ظفر علی خان کے لاہور سے شائع ہونے والے روزانہ اخبار "زمیندار" سے قیصر صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس کا ذکر آتے ہی انھوں نے فرمایا کہ "زمیندار" ایک اخبار کا نہیں ایک ادارے کا نام تھا، جس سے مولانا عبدالمجید سالک، علامہ نیاز فتحپوری، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبداللہ العمادی، مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی، قاضی محمد عدیل عباسی، منشی وجاہت حسین جھنجھانوی، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، علامہ حسین میر کاشمیری، حاجی لق لق اور جناب مضطر ہاشمی جیسے ممتاز اہل قلم وابستہ رہے، "زمیندار" کے متعلق بعض دلچسپ اور معلومات افروز باتیں بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مولانا حسرت موہانی کے بعد مولانا ظفر علی خاں پہلے مسلم گریجویٹ تھے جو اردو صحافت میں شامل ہوئے جس سے اردو اخبار نویسی کا درجہ بلند ہوا اور اس زبان کے جاننے والوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ صحافت ایک معزز پیشہ ہے، زمیندار نے نہ صرف عوام میں اخبار بینی کا ذوق پیدا کیا بلکہ ان میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کیا۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کو اتحاد بین المسلمین کا بھولا ہوا درس بھی یاد دلایا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب یہ اخبار صوبہ سرحد میں پہونچتا تو پٹھان

ایک آنہ دے کر تو "زمیندار" خریدتے اور ایک آنہ پڑھوائی کے لئے دیتے، کانپور میں جب مچھلی بازار کی مسجد کے انہدام کا سانحہ پیش آیا تو زمیندار نے برطانوی حکومت کے خلاف سخت موقف اختیار کیا، کانپور کے چمڑے کے سوداگروں نے ایک قاصد کے ہاتھ دو ہزار روپے کی رقم مولانا ظفر علی خان کو بھجوائی اور لکھ بھیجا کہ زمیندار اپنے اسٹینڈ پر ڈٹا رہے، ان دنوں جب زمیندار کا بنڈل کانپور پہونچتا تو اس کا ایجنٹ دوکان کا دروازہ اندر سے بند کر لیتا تاکہ گاہک بے تابی اور جوش کے عالم میں اخبار چھین کر نہ لے جائیں، صبح دس بجے تک تو کانپور میں یہ اخبار ایک آنہ میں بکتا مگر اسکے بعد آٹھ آنے میں بھی مشکل سے دستیاب ہوتا، اس زمانے میں زمیندار کی روزانہ اشاعت تیئس ہزار تھی، اس دور میں اور اس کے بعد بھی حصولِ آزادی تک اردو کے کسی روزنامہ کو اتنی اشاعت حاصل نہ ہوئی۔

گفتگو جاری تھی کہ اتنے میں خاندانِ انوریہ کے دیرینہ مداح اور میرے دیرینہ مخلص ماہنامہ الرشید کے مدیر اعلیٰ مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی تشریف لے آئے ان کے ساتھ قصور میں مقیم روزنامہ "مشرق" کے نمائندے حافظ عبدالقادر انور بھی تھے، بھاولپور کے مشہور زمانہ مقدمہ میں علامہ سید انور شاہ کاشمیری رح کے تاریخی بیان کا ذکر چھڑ گیا، تو مولانا قیصر نے اس مقدمہ سے متعلق بعض اہم باتیں بیان کیں، میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو قیصر صاحب نے اپنی کتاب "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" کی ایک جلد اپنے مبارک دستخط کے ساتھ مجھے عنایت کی اور "اشاعتِ حق" کا جشنِ صدسالہ نمبر بھی مجھے دیا۔

مولانا قیصر سے میری دوسری ملاقات سید راحت شاہ کی شادی کی تقریب میں ہوئی، مولانا نے مجھے خاص طور سے اس میں شامل ہونے کے لئے بلایا تھا، دعوت ولیمہ میں ممتاز شخصیتوں کا جو اجتماع تھا اس سے دیوبند اور اس کے گرد و نواح میں مولانا کی مقبولیت و ہر دلعزیزی صاف عیاں تھی، خاندانِ انوریہ اپنی علمی خصوصیات کی بنا پر پورے علاقے میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس خاندان کے افراد اپنی دینی عظمت کی بنا پر ہندوستان بھر میں امتیازی شہرت رکھتے ہیں، دعوتِ ولیمہ میں مولانا قیصر کے چھوٹے بھائی مولانا سید انظر شاہ مسعودی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو ان دنوں دارالعلوم کے قائم المقام صدر المدرسین تھے اور دیوبند

سے اپنا پندرہ روزہ اخبار "یثرب" بھی نکالتے تھے، مولانا سید انظر شاہ صاحب کی شخصیت ان کی بے پناہ علمی وفکری صلاحیتوں کی آئینہ دار تھی اور انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں میرے قلب وذہن کو گرفت میں لے لیا، خاندانِ انوریہ کے بعض دیگر افراد سے بھی بات چیت کی سعادت حاصل ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ اس گھرانے کے ساتھ میرا جنم جنم کا رشتہ ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس خاندان میں سکھ اور دکھ کے ہر موقعہ پر ناچیز کو یاد کیا جاتا ہے۔

مولانا سے میری تیسری اور آخری ملاقات قریبًا چار سال قبل ہوئی جب میں انجمن ترقی اردو یوپی کی سالانہ کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے سہارنپور گیا، کانفرنس سے فارغ ہو کر میں چند گھنٹوں کے لئے دیوبند گیا تاکہ مولانا کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرسکوں، مولانا نے ماہنامہ دارالعلوم میں میرے چند مضامین شائع کئے تھے، جس کی وجہ سے مجھے علماء دیوبند سے قریب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، ہندوستان اور پاکستان کے مشہور اخبارات ورسائل میں میری تخلیقات شائع ہوئی ہیں لیکن "دارالعلوم" جیسے مؤقر جریدہ میں چھپنا میرے لئے فخر کی بات تھی، شاہ منزل پہونچا تو مولانا قیصر کا وہی عالمانہ اندازِ گفتگو تھا، لیکن وہ کچھ بجھے بجھے نظر آرہے تھے، دارالعلوم سے ان کا عملی تعلق ٹوٹ چکا تھا، جن لوگوں کے ساتھ عمر گذاری تھی وہ ان سے بچھڑ چکے تھے بلکہ بہت سے پرانے ساتھی انکے خلاف ہو گئے تھے، یہ ان کی زندگی کا عجیب تجربہ تھا جن لوگوں نے ان سے ادب وصحافت کے سبق سیکھے تھے وہی اپنے نوکِ قلم سے انکے جسمِ ناتواں کی چیر پھاڑ کررہے تھے، عجیب افسردہ زندگی تھی، میں انکے زخموں کا کیا مداوا کرسکتا تھا، عرض کیا: مجھے دارالعلوم سے عشق ہے، آپ اجازت دیں تو دارالعلوم کے تنازعہ کو ختم کرانے کیلئے بھوک ہڑتال کرنے کیلئے تیار ہوں، شاید میری تڑپ دیکھکر کسی کا ضمیر جاگ اٹھے، میں یہ تو نہیں جانتا کہ حق پر کون ہے اور غلط کون لیکن دارالعلوم سب کی مادرِ علمی ہے اور ہر ایک کو اپنی ماں کے آغوش میں بیٹھنے کا حق حاصل ہے"۔ مولانا قیصر نے فرمایا: میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن بھوک ہڑتال از روئے شریعت ممنوع ہے، سب اللہ پر چھوڑ دو، وہی کارساز ہے

دارالعلوم کے تنازعہ سے قیصر صاحب کی زندگی بکھر کر رہ گئی تھی بلکہ وہ اندر سے ٹوٹ چکے تھے، اس دارالعلوم کے دروازے ان پر بند ہو چکے تھے جسکے چپے چپے پر ان کے قدموں کے نشان نقش تھے غالبًا یہی غم انھیں موت کی گود میں لے گیا

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

****

ادب و صحافت کی نمائندہ شخصیت

مولانا راشد وحید قاسمی صاحب

دیوبند میں علم و ادب، تفسیر و حدیث، فقہ و تاریخ، زبان و بیان اور تصوف و عرفان کے کتنے شیرخوار انگوٹھا چوستے داخل ہوئے، لیکن جوں جوں ان کے ذہن و دماغ پر ماہتاب قاسمیہ کی بلوریں کرنیں پڑنی شروع ہوئیں اور ان کے قلوب و نگاہ نے علمی کہکشاؤں سے نور چننے اور عرفان و ادراک کے ابر رحمت کی ٹھنڈی اور جاں نواز پھواروں سے نہانے کا عمل جاری رکھا، ان کے قدم اپنی منزل کی طرف تیز تیز اٹھنے لگے، سینے علوم نبوت سے معمور ہوگئے، اعضاء و جوارح علم کے تقاضوں پر لبیک کہنے لگے، زبان دماغ کی ٹکسال میں ڈھل رہے فکر امت اور دل کی کان میں پرورش پا رہے، جذبۂ اقامت دین کے لعل و جواہر اگلنے لگی اور انھوں نے شیرخواری سے مراہقت اور شباب کی منزلیں اس شفافیت سے طے کیں کہ نہ ان کا باطن داخلی اوہام و وساوس کے سیاہ دھوئیں سے داغدار ہوا اور نہ ان کا ظاہر خارجی دنیا میں اٹھنے والے فکری و اعتقادی فتنوں اور چلنے والی ہوس و جنس کی باد سموم سے پژمردہ اور گرد آلود، نہ ان کی نگاہ پارسا کو نمائش گاہ عالم کی زہد شکن روشنیاں خیرہ کرسکیں، اور نہ ہی ان کی اقلیم خودی و خداشناسی کو وقت، مصلحت اور زندگی کے ابلہ فریب تقاضے سر کرسکے وہ جس حسن طلب اور مقصد بلند کے ساتھ ایوانِ دارالعلوم میں وارد ہوئے اپنے ذوق و جذبات اور ظرف و ترجیحات کی میزان سے فزوں تر لے کر واپس ہوئے، انھیں کسی دور اور مرحلہ میں اپنی تنگ دامنی اور مفلسی کا احساس نہیں ہوا، بلکہ ان کے پائے طلب نے جس قدر

تشنگی کا اظہار کیا زمزمِ علم اپنا دائرہ فیض وسیع کرتا رہا اور ان کا طائرِ پرواز جتنا بلند ہوتا رہا عطا کے آسمان اسی قدر اپنی آغوش وا کرتے گئے۔

انھوں نے سرچ لائٹ کی طرح علوم وفنون کے مہر وماہ سے اکتسابِ نور کیا اور انکسار و فروتنی کی ثمر بار ٹہنیوں کی مثال گردنیں جھکائے حیاتِ انسانی کی تنگ وتاریک وادیوں میں نازل ہوئے اور اپنے نورِ باطن اور فیضانِ نظر سے انھیں بقعۂ نور بنا دیا۔ وہ زمین و زمان کی جتنی سرحدیں پار کرتے رہے علم وعرفان کے علم گاڑتے گئے، اور جہل وخود فراموشی کی جن بنجر زمینوں پر قدم رنجہ ہوئے خود شناسی وخدا آگاہی کے سبزہ زار اگا دیئے۔ اگر پتھر پر نظر پڑ گئی تو ہیرا ہو گیا، مٹی کو چھو لیا سونا بن گئی، اور ذرات پر توجہ کر دی، قندیل بن کر چمکنے لگے۔

یہ الگ بات ہے کہ ہر پھول رنگ وبو کے لحاظ سے اپنی انفرادیت قائم رکھے رہا اور علم و فن کے بیشتر سرچشموں کی دریافت اور فضل وکمال کے جملہ محاسن وکمالات سے معمور ہونے کے باوجود کسی ایک میدان کو اپنی جولان گاہ بنایا، اور اسی میدانِ کار میں اپنی عظمت وانفرادیت کے جوہر دکھاتے جسمِ خاکی کا ساتھ چھوڑ دیا۔

چنانچہ کسی نے چمنستانِ قرآن کی آبیاری کی وہ عبید اللہ سندھی بن کر چار دانگِ عالم میں چمکا، کوئی مسندِ حدیث کا شہ نشین ہو، اس کے سر پر امام العصر کا تاج زریں سجا دیا گیا، اور دنیائے فضل پر چیخ اٹھی آتنا عظیم الشان محدث کئی صدیوں کے بعد پیدا ہوا، کسی نے فقہ کے سمندر میں غواصی کی اور مفتی اعظم یا فقیہ الامت بن گیا، کوئی تاریخ وآثار کے کھنڈرات میں اترا تو مورخِ اسلام کے خطاب سے نوازا گیا، کسی نے ملتِ اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کے لئے جہد وجہاد کے خارزار چنے وہ شیخ الہند، شیخ الاسلام اور مجاہدِ ملت کے نام سے یاد کئے گئے، کوئی اسلام بے زار مسلمانوں کے علاج روحانی پر کمربستہ ہوا تو حکیم الامت کہلایا کسی نے معقولات کے عصری پیرایہ میں اسلام کی ترجمانی کے لئے خطابت کی اسٹیج سنبھالی تو حکیم الاسلام اور رئیس الاحرار بن گیا، کوئی کلک وکاغذ لے کر اسلامی علوم وفنون پر لکھنے بیٹھا تو کئی سو کتابیں منظر عام پر آگئیں، اور وہ خود احیاءِ اسلام اور متجددین دین کے اس عظیم الشان کارنامہ کی بنیاد پر مجددِ ملت قرار پایا۔

انھیں کے حلقہ بگوشوں اور خوشہ چینوں کی صف سے ایک نوخیز قلم کار تیشہ بدست نکلا، اور سنگِ صحافت پر سیر و مناقب، بشارت و عبرت، پند و موعظت اور اصلاح و تربیت کے اسلامی نقوش، علمی، ادبی، افسانوی اور تاریخی رنگ و آہنگ سے کندہ کرنے لگا، یہ اپنے اسلوب اور لہجہ کا منفرد انشا پرداز دیوبند کی سب سے قد آور شخصیت محدثین کے امام، فقہاء و مفسرین کے سرخیل علوم و فنون کے بحرِ ذخار، اپنے عہد کے ابن حجر امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری کے عائلی مطلع سے ۱۳۳۹ھ میں ایک ننھے چاند کی صورت طلوع ہوا، تاریخی نام مظفر حسین تجویز ہوا، لیکن جب اس کی تحریریں ظفر و اقبال کے دوش پر لہرا کر اپنی کرنیں بکھیرنے لگیں تو اسمِ ذات ازہر شاہ قیصر کے اسمِ صفت کے دوش بدوش نہ چل سکا اور تھک ہار کر گھر کی چہار دیواری میں گوشہ گیر ہو گیا۔

والدِ ماجد علامہ کشمیری رحمہ اللہ جن کی شاگردی عرب و عجم کے بلند پایہ علماء و محدثین کے لئے سرمایۂ افتخار تھی اور جن کے کارخانۂ علم و فضل سے تیار ہو کر مولانا یوسف بنوری، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع دیوبندی اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب سے جانے کتنے میرِ کارواں اور سالارِ قافلہ نکلے تھے۔ نے اپنے لختِ جگر اور نورِ نظر کی تعلیم و تربیت کے کیا کیا انتظامات کئے ہوں گے، اور شخصیت گری کے کتنے عظیم الشان منصوبے ترتیب دیئے ہوں گے۔ لیکن نوشتۂ تقدیر کہ یہ بچہ ابھی عمر کی ۱۳؍ بہاریں ہی دیکھ پایا ہے کہ والدِ ماجد حیاتِ فانی سے روٹھ کر حیاتِ سرمدی کے ابدی اور جانفزا لالہ زار میں قدم رکھ دیتے ہیں۔ دنیائے فضل و کمال کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک جاتی ہے، اساطینِ علم و ادب کا کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے اور علمی محلات میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے، ۱۳؍ سالہ نابالغ شعور کا وجود ہی کیا، اسکے مستقبل کا شیش محل بکھر جاتا ہے اور تعلیمی سلسلہ فضا میں تیرتے سیاروں کی طرح معلق ہو جاتا ہے، لیکن اب تک والد محترم کے فیضِ کرم اور مردم ساز اساتذہ کے ہاتھوں تعمیرِ شخصیت کی جو مضبوط بنیاد پڑ چکی تھی، ذاتی مطالعہ سے اس پر ردے رکھنا کوئی مشکل کام نہ تھا، چنانچہ والد مرحوم کے فراق کا غم غلط کرنے اور یتیمی کی بے رحم اور تپتی دوپہر سے اپنے کمسن وجود کو محفوظ رکھنے کے لئے صحافت کی ٹھنڈی اور پر سکون چھاؤں کا سہارا لیا اور اپنی فکر، شخصیت اور داخلیت کی اس طرح تشکیل و تعمیر کی کہ ان کا ظاہری وجود تو زندگی کے کسی موسم

میں جلتے سورج کے نیچے اور گرم سنگلاخ چٹانوں پر بھی رہا، لیکن اندرون صحرا کے اسی گھنیرے اور سخت جان درخت کی طرح پرسکون باوقار، ٹھنڈا اور راحت بخش رہا اور بیرونی دنیا کا بڑے سے بڑا انقلاب اور اندوہناک سانحہ ان کی داخلیت کی سنجیدہ سطح کو برہم نہ کرسکا، اور یہی سنجیدگی، ٹھہراؤ، ثبات، پختگی اور سادگی ان کی قلمی روش اور صحافتی مزاج کی شناخت قرار پائے جہاں وہ ایک شوخ اور کھلنڈرے نوجوان کی طرح افسانوں اور ناولٹوں کی رفاقت میں "حور" و "سہاگ" کے آنگن میں اترے اور "شاعر" "شرابی" "انقلاب" "آزادی" اور "ٹوٹا ہوا آئینہ" سے بے شمار شوخ چلبلے اور تیکھے افسانے لکھ کر ادبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کیا، لیکن امام العصر سے نسبی و روحانی نسبت اور ان کے زیر سایہ ۱۳ رسالہ تربیت کے نتیجہ تشکیل پانے والی افتادِ طبع زیادہ دنوں تک ان کے سفر بے سمت کا تحمل نہ کرسکی اور بالآخر انھیں علمی، ادبی اور اصلاحی صحافت کے دھارے میں شامل کردیا، جہاں سے وہ اپنے مخصوص لب ولہجہ میں علمی دینی اصلاحی، ادبی اور سیاسی مضامین لکھ کر ملتِ اسلامیہ کی رہبری و رہنمائی کا فریضہ انجام دینے لگے، اہل خرد اور اربابِ نظر نے اس جوہرِ قابل کو تحریک دارالعلوم کے فکری ترجمان ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت سونپ دی، پھر کیا تھا ازہر شاہ قیصر کا دارالعلوم کے ترجمان سے ربط وانسلاک اتنا بابرکت ثابت ہوا کہ ایک طرف رسالہ کا علمی ادبی وقار بڑھنے لگا، قدردانوں کے دائرہ میں حیرت انگیز حد تک توسیع ہوتی گئی، اور جس رفتار سے رسالہ کا معیار بلند ہوتا گیا اسکے مدیر کا ادبی اور صحافتی نقش آپ پختہ ہوتا گیا، اور یہی اس دنیا کی محکم صداقت ہے کہ جب کسی ادارہ کے معمار ادارہ کی ترقی اور نیکنامی کے لئے اپنے وجود کو فنا کردیتے ہیں تو وہ آخرت میں ثواب کے مستحق ہوتے ہیں اور طوعاً وکرہاً دنیا بھی ان کے روحانی وجود کو نظر انداز نہیں کرپاتی۔

مولانا نے فنائیت کا اصول اپنے والد رحمہ اللہ سے ورثہ میں پایا تھا، اسی کے پیشِ نظر اپنی ادبی، فکری، علمی اور جسمانی توانائی کا آخری قطرہ بھی ماہنامہ دارالعلوم کے لئے نچوڑ دیا، اور ۳۵ رسال تک رسالہ کی ترتیب و تہذیب سے کتابت وطباعت اور آمد وصرف کے حسابات منصبی انا سے قطع نظر پوری دیانت، متانت اور شرحِ صدر کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ جس سے رسالہ

کیا دارالعلوم کی نیک نامی کے ساتھ مولانا کی مخلصانہ فنائیت ان کی تخلیقات و انشائیات کے لئے بھی آبِ حیات فراہم کرتی گئی، اور آج جب کہ مولانا ہمارے درمیان سے عرصہ ہوا اٹھ چکے ہیں، ہم ان کی شخصیت، مزاج و مذاق، رنگ و آہنگ، طرز و ادا، فکر و رجحان اور علمی ادبی قد و قامت ان کی تحریروں کی تختیوں پر پڑھ سکتے ہیں، جو نہ انسان ہیں کہ جھوٹ ان کی نظر میں سچ سے زیادہ عزیز ہو نہ حیوانات کے قبیل سے جنھیں اخلاقیات و آدابِ زندگی کا مخاطب نہ سمجھا گیا ہو، نہ نباتات ہی جنھیں تہہ نشینی سے نفرت اور خودسری و خودنمائی کا سودا ہو۔ وہ جمادات ہیں، سچے اور سادہ لوح آئینہ خانے جو اپنی قید تحریر میں اجنہ و شیاطین کی منصب جہانبانی سے معزولی کی داستان بھی لئے ہوئے ہیں، اور نوعِ بشر کا خلافت و جہاں آرائی کے لئے انتخاب اور اس کی حلف برداری کی تاریخی دستاویزات بھی، وہی آئینے بول رہے ہیں کہ ازہر شاہ قیصر ایک بلند پایہ صحافی، ایک دردمند انسان اور ایک سچے اور حساس انشا پرداز تھے، جنھیں لکھنے اور صرف لکھنے سے کام تھا، گویا وہ اسی کے لئے خلق کئے گئے تھے۔ ان کے قلم سے ایک دو نہیں ہزاروں طویل و مختصر مضامین و مقالات ابھرے اور کائنات علمی میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ کبھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے عنوان پر قلم اٹھایا تو اسحاق اخرس جیسے مدعیانِ نبوت کے جھوٹ و فراڈ اور بے حیائی و ڈھٹائی کی قلعی کھول کر رکھ دی، اور منصب نبوت و رسالت کی عظمت اور اسکے اللہ رب العزت کی طرف سے عطیۂ خاص اور نبیوں کے استحقاق نبوت کا مقام بلند اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سلسلۂ زریں کی تکمیل کا یقین دل و دماغ میں روح کی طرح پیوست ہو جائے اور پھر متنبیوں کے لاکھ دلائل اس پر کسی کروٹ اثر انداز نہ ہو سکیں۔

اسلام و جہالت کی معرکہ آرائی پر خامہ فرسائی کی تو توحید و شرک کے باہمی فاصلے، شرک کے اسباب، نفسیاتی کمزوریاں، غیر فطری اثرات اور نامعقولیت، نیز اسلام کی حقانیت، فطری پاکبازی، مقاصد بلند اور زندگی اور کائنات پر مرتب ہونے والے مقدس اثرات چند سطروں میں اس طرح سمیٹ لیتے کہ مشرک قاری اپنی تہی دامنی اور حرماں نصیبی پر گریباں پھاڑنے لگے اور خوش عقیدہ مسلمان اپنی اعتقادی شہنشاہیت اور بیدار بختی پر رقص کرنے لگے۔

ملتِ اسلامیہ کو قناعت کا درس اور حرص و آز سے نفرت دلانے کا داعیہ پیدا ہوا، تو

عہدِ موسوی کے برباد شدہ اور آفت زدہ مالدار قارون جس کی روگردانی اور تباہی کو قرآن نے نمونۂ عبرت بنایا ہے کا انتخاب کیا اور مال کی نحوست مالداری کے مہلک جراثیم اور انجام کار پر اس تفصیل اور دل نشیں انداز سے روشنی ڈالی کہ قاری فقر یا قناعت پر عش عش کر اٹھے، اور بے لگام امارت پر تھوتھو۔

اسی طرح ملکی و بین الاقوامی سیاست پر جو اداریے اور مضامین قلمبند کئے ان میں پوری بصیرت اور دیدہ وری کے ساتھ اسلامی سیاست کے تابناک ماضی، تاریک حال اسباب وعلل اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مذہبی سرد مہری، ثقافتی ابا اور عملی ارتداد کے معتدل اور سائنٹفک جائزہ کے ساتھ جمہوریت، ڈیموکریسیت کمیونزم اور سوشلزم کی شکل میں موجودہ نظامہائے سیاست کی فکری کج ادائی، مقصدی نامرادی، اربابِ مملکت اور رعیت کے درمیان وسیع فاصلوں اور ناقابل برداشت نابرابریوں پر مبصرانہ بحث کی اور ان خود ساختہ نظاموں کی سرپرستی اور سائے میں پروان چڑھنے والی نئی نسل میں اعتقادی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں اور پنپنے والی حیا سوز اور انسان دشمن محرکات پر منصفانہ تنقید کی۔ اور خلافتِ اسلامیہ کے سیاسی آسمانی اور الٰہی نظام حیات کی صورت اس کا واحد دائمی اور پائیدار حل پیش کیا۔

مضامین کے الفاظ نیلم و پکھراج کی مثال آبدار فقرے چست و چوبند ساخت ٹکسالی زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط اور سچے جذبات کی مسلکی روح میں پروئے ہوئے، اسلوب دلکش، لہجہ سطح آب پر تیرتی بطخ کی طرح سبک رو، سمع خراش گھن گرج نہ دل شکن عرض معروض، جا بجا شہد کی شیرینی، شرابِ ناب کی تلخی، طنز و تعریض کے نشتر اور ہمدردی و غمخواری کے پھاہے سجے ہوئے ابتدا سے انتہا تک حیرت انگیز یکسانیت اور اٹوٹ تسلسل جو صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ پورا مضمون قلم برداشتہ اور ایک ہی مجلس میں لکھا گیا ہو۔ ورنہ مجلس کی تبدیلی اور قدم قدم پر فکر کا عجز، ہچکچاہٹ اور جھنجھلاہٹ مضمون کی سلاست و روانی کو ختم کر دیتی ہے، اور یہی وہ کسوٹی اور معیارات ہیں جن پر کسی انشاپرداز کی انشائی عظمتوں کو تولا جاتا ہے۔ مولانا کی تحریریں ان معیار پر پوری اترنے کے ساتھ ایک اور خصوصیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ وہ ان کی رسا فکر اور علمی وسعتِ نظری ہے جس سے عام صحافت محروم ہوتی ہے، لیکن مولانا کی یہ خصوصیت ان کے صحافتی قد و قامت

میں اسی طرح گم ہو گئی جیسے ان کے برادر خورد مولانا انظر شاہ کشمیری کی محدثانہ عظمت شان کے سامنے ان کی ادبی، فنی اور شخصی بلندیاں، جس کی وجہ یہ ہے کہ خارجی دنیا کی طرح شخصیت کی داخلی جمہوریت میں بھی مختلف صلاحیتوں اور استعدادوں کے درمیان سرد جنگ جاری رہتی ہے، اور ذوق جس کی حمایت کر دیتا ہے وہی خارجی دنیا کا سکندر قرار پاتی ہے۔ مولانا کا ذوق چونکہ صحافت تھا، اس لئے صرف صحافی کے روپ میں پہچانے گئے اور ان کی علمیت، عملیت اور وسعتِ نظری دھری کی دھری رہ گئی۔

بایں ہمہ مولانا ایک نباض صحافی گر بھی تھے، دارالعلوم میں زیرِ تعلیم طلبہ کی استعداد و لیاقت کا جائزہ لیتے رہتے اور جس کے اندر صحافتی جراثیم نظر آجاتے، فراغت کے ساتھ اسے رسالہ دارالعلوم کی دفتری ملازمت کی پیش کش کر دیتے، پھر اس کی اس ڈھب سے تربیت فرماتے کہ وہ سال دو سال میں نہ صرف صحافت سے مانوس ہو جاتا بلکہ کاغذ و قلم کا ایک اچھا کھلاڑی بن جاتا، اور ہر عنوان پر بے ساختہ اور برجستہ لکھنے کی اہلیت اس کے اندر پیدا ہو جاتی، پھر دوسرے اور تیسرے نووارد کا اسی طرح استقبال کرتے۔ ان میں کچھ تو اس حال میں قدم رکھتے کہ ایک سطر بھی لکھنے کی انھیں قدرت نہ ہوتی، لیکن مولانا کی ترغیب و تحریک اور تدریب و فیضان انھیں بہت جلد منزل کی سمت تیز گام کر دیتی، دفتر ماہنامہ دارالعلوم کی اسی تربیت گاہ سے مشہود اقبال، حامد الانصاری، انوار الحق بیدل، زبیر جونپوری اور فرحت ہاشمی سے جانے کتنے نوجوان مستقبل کے ممتاز ادیب اور نقاد و مصنف بن کر نکلے، جنھیں دفتر سے منسلک ہوتے وقت قلم پکڑنے کا بھی سلیقہ نہیں تھا، لیکن رفتہ رفتہ مولانا کی نگاہ فیض اثر سے بی۔ اے، ایم اے کے ایگزام دے کر اپنی علمی سطح بھی بلند کرتے گئے، اور معدنِ صحافت میں کروٹیں لیتے لیتے ادب و ثقافت کے نقیب بھی بنتے گئے، بسا اوقات اس افتادِ طبع پر مولانا کو بڑے حلم و تحمل اور صبر و برداشت کا مظاہرہ کرنا پڑتا، جب دفتر کا نووارد ملازم اور ان کا زیرِ تربیت مستقبل کا صحافی امور دفتر سے متعلق اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے بھی ناواقف ہوتا، لیکن مولانا ماتھے پر شکن لائے بغیر اس سے متعلق امور بھی خود انجام دیتے، اور جب اسے بنا سنوار دیتے تو بیگار لینے اور کام نکالنے کے لئے اسے روک کے رکھنے کے بجائے سندِ فراغت دیکر اسے میدانِ عمل میں اتار دیتے۔

یہ دوسروں کے کام آنا اور ان سے کام نہ نکالنا صرف ادبی اور صحافتی نسبت تک محدود نہیں تھا بلکہ محلہ اور جوار کے جانے کتنے غریب و ضرورتمند خانوادوں کی ضرورت ان سے پوری ہوتی رہتیں اور وہ رازداری اور کشادہ ظرفی کے ساتھ یتیموں اور بیواؤں اور بے نواؤں کے کام آتے رہتے۔ اسی طرح اندرونِ دارالعلوم امام العصر کے فرزند اور مہتمم دارالعلوم کے استاذ زادہ ہونے کی نسبت پر دارالعلوم کے مختلف شعبوں کے ملازمین اور وہ بھی جاروب کش اور دربان، فراش و چراس راہ چلتے اپنے مسائل اور دشواریاں پیش کرتے اور مولانا انھیں لئے دفتر اہتمام پہونچ جاتے اور ان کی وکالت کرکے مسائل حل کرادیتے۔ لیکن کبھی اپنی ذات یا اہلِ قرابت کے لئے دارالاہتمام یا اراکینِ شوریٰ کے سامنے درخواست گزارنا گوارہ نہیں کیا نہ کسی عہدہ اور منصب کی طلب کو اپنے قریب پھٹکنے دیا۔

طبیعت بڑی مرنجا مرنج پائی تھی، خود بھی ہنستے مسکراتے رہتے اور محفل کو بھی لطیفوں چٹکلوں اور چیستانوں سے قہقہہ زار بنائے رہتے، ظرافت خوش طبعی اور بے تکلفی ان کا خاصہ تھا، جس سے ہم عمر بزرگ اور خورد یکساں لطف اندوز ہوتے، لیکن کبھی کسی کی تضحیک اور دل شکنی گوارہ نہ کرتے، وقتاً فوقتاً اپنے محبوب شاعر آغا شورش کاشمیری اور احسان دانش کی پوری پوری غزلیں لطف لے لے کر سنانا شروع کردیتے، لیکن اشعار خوانی بھی اسی انداز سے ہوتی کہ ہم نشین اشعار کی شعری اور فنی حیثیت کا بآسانی احساس کرلیتے،

یہ دل لگی اور خوش وقتی کی مجلسیں بھی مستقل ادبی اور سماجی درس ہوتیں جن میں زندگی کے وسیع ترین حقائق، عبرتیں اور زمینی صداقتیں پوشیدہ ہوتیں۔

البتہ سفر کے نام سے مولانا اس طرح سنجیدہ ہوجاتے جیسے مسکرانا جانتے ہی نہ ہوں، اور ان کے سامنے زندگی کا کوئی نازک ترین موڑ آگیا ہو، حتی الامکان اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتے اگر پھر بھی یہ بلا نہ ٹلتی تو کئی روز پہلے ہی سے سفر کی تیاری شروع کردیتے، پورے سفر میں خاموش رہتے اور دن کے دن ہی واپس آنے کی کوشش کرتے، گویہ سفر بیزاری ان کی اضافی ترقیات اور شہرتوں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنی اور اسی سفر گریزی کی بنیاد پر وہ خصوصی طور پر انوائیٹ (INVITE) ہونے کے باوجود ملکی سطح کے عظیم الشان پروگراموں اور تاریخی کانفرنسوں میں شرکت نہ کرسکے، لیکن اپنی اس افتادِ طبع اور وحشت سفر کو دور کرنے پر وہ آخر تک قادر نہ ہوسکے

ہاں کچھ مواقع ایسے ضرور آئے جب انھیں پابندی اور پامردی کے ساتھ صحرا نوردی کرنی پڑی، وہ بھی آل انڈیا ریڈیو دہلی تقریر کے لئے، امام العصر پر منعقد ہونے والی وادیٔ کشمیر میں تاریخی کانفرنس کے لئے یا پھر دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس کی تیاریوں کے لئے، ورنہ ملک و بیرونِ میں جہاں جہاں وہ پہونچے اپنی صحافت کے حوالہ سے پہونچے جسمانی وجود اکثر دیوبند کی جغرافیائی حدود میں مقید رہا۔

مزاج میں بے پناہ سادگی اور قابلِ رشک انکسار تھا، چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے کہ کچھ دیر کے لئے انھیں اپنے بڑے ہونے کا احساس ہونے لگتا، اور اپنی ذات کی طرف سے اتنا تغافل کہ لباس کی پرواہ نہ ہیئت کی، کھانے پینے کی نہ سونے جاگنے کی، ایک منتشر اور لاابالی زندگی بال بکھرے ہوئے ٹوپی ہر رخ بدلتی ہوئی، کپڑے دھلے نہ دھلے، شیروانی کا رنگ ہرا، پیلا، نگاہیں کھوئی کھوئی ——— ناشتہ دن چڑھے، دن کا کھانا رات کو، رات کا خدا حافظ، مجلس جمی رات بیت گئی، لکھنے پڑھنے بیٹھے صبح ہوگئی، کتاب اٹھائی تو ختم کر کے ہی پہلو بدلا، لکھتے پڑھتے سو گئے اور سوتے سوتے لکھنے پڑھنے میں مشغول ہوگئے، ایک نشہ کی سی کیفیت اور مدہوشی و جنون کا سا دھوکہ، کم نظر اسے عیب کہتے ہیں لیکن اہل خرد کی نظر میں یہی کمال ہنر ہے جس کے بغیر دنیا کے کسی بھی فن کا نمائندہ سچا فنکار کہلانے کا مستحق نہیں، وہ آرٹسٹ ہو یا مہندس مصور ہو یا مفکر اور شاعر ہو یا انشا نویس خود فراموشی کی منزل سے ہر ایک کو گزرنا پڑتا ہے، جسے یہ دنیا راس آجاتی ہے اسے حیاتِ جاودانی مل جاتی ہے، روحانیت اور بقاء سے بھرپور زندگی، اور جو اہل جنون کی نسبت خرد کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اور اس روحانی وجد و کیف اور مدہوشی پر جسمانی آگہی کو قربان نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی شخصیت ان کی بے ہمتی اور عیش کوشی کی تنگنائی میں آپ قربان ہو جاتی ہے اور وہ اپنی ذات کے خول سے نکل کر وسیع اور روشن دنیا میں دین و مذہب ملک و ملت اور خویش و بیگانوں کے لئے کوئی ممتاز علمی ادبی، فنی، تخلیقی، اصلاحی، انقلابی اور سیاسی سماجی خدمت انجام نہیں دے پاتے ——— جب کہ دیوانے ہاں گدڑی میں لعل کی طرح گندے سندے کپڑوں میں لپٹے ہوئے بے سُرے اور پتھریلے، نحیف و لاغر ہیولے اپنی اسی مدہوشی اور فنا شعاری سے کائنات ہستی میں بڑے سے بڑے انقلاب کا باعث قرار پاتے ہیں اور انھیں کے افکار و رجحانات کی بنیادوں پر تمدن و ثقافت کے تاج محل تعمیر ہوتے ہیں،

یہ ہیولے اگر خود فراموشی کا لبادہ اتار دیں تو دنیا کے طول و عرض میں خدا فراموشی کا رجحان سر ابھارنے لگے ، یہ اپنے فکری جنوں کو خیر باد کہہ دیں تو علم و ادب ، فلسفہ و سائنس ، تہذیب و ثقافت ، ریاضی و ہیئت اور صنعت و حرفت کے فلک بوس منارے زمیں بوس ہو جائیں ، لیکن یہ اپنے پیارے اور جان سے زیادہ عزیز جنوں کے ساتھ اپنی نازک و حساس منصبی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوتے ، اور خوشی و غمی صحت و مرض اور موسموں کی ستم ظریفی ان کے فرائض پر اثر انداز نہیں ہو پاتی بلکہ ناسازگاری حالات ان کی کارکردگی کے لئے زیادہ سازگار ہوتی ہے اور وہ موافق سے زیادہ مخالف حالات میں کام کر جاتے ہیں ، یہی وجہ ہے کہ ایک دیوانہ ادیب ۳۵ رسال سے زیادہ عرصہ تک ماہنامہ دار العلوم کے ادارتی منصب پر فائز رہتا ہے اور ایک بار بھی رسالہ اپنے وقت معین سے مؤخر نہیں ہوتا ، نہ مضامین کا قحط پڑتا ہے نہ معیار کی کساد بازاری ہوتی ہے نہ کام چوری اور کوتاہ کاری کو چھپانے کیلئے اعذار و امراض کی درخواستیں فائل سے منسلک ہوتی ہیں ، ایسا نہیں کہ ادبا کی جنس پتھر کی ہوتی ہے بلکہ یہ آئینہ سے زیادہ حساس ہوتے ہیں اپنے فرض میں بھی اور عزت نفس کے سلسلہ میں بھی ، شکوہ شکایت کا موقع دیتے ہیں نہ خواہ مخواہ کی جھڑکیاں اور گیدڑ بھبکیاں برداشت کرتے ہیں ان کا جسم جتنا بے حس اور ملگجا نظر آتا ہے دل کا شیشہ اس قدر حساس اور شفاف ہوتا ہے یہی وجہ ہیکہ یہ قوم دوسروں کی نسبت زیادہ جلد اور شدت کے ساتھ محسوس کرنے کی استعداد رکھتی ہے اور دل کو ٹھیس پہونچنے کے بعد ایسی روٹھتی ہے کہ پھر منائے نہیں مانتی ، اور بسا اوقات یہی دل شکستگی اس کا پیغام اجل بن جاتی ہے ۔ ایسے ہی کچھ غیر متوقع ناخواہیوں اور ناگواریوں کا سامنا ماہنامہ دار العلوم کے اس کہنہ مشق اور حساس مدیر کو بھی ہوا ، اس کا آئینہ دل ٹوٹ گیا اور وہ خاموشی کیساتھ اپنے منصب سے کنارہ کش ہو کر محلہ خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گیا ، چند سال اعذار و امراض اور جز وقتی مشاغل میں بیتے اور بالآخر نصف صدی کا یہ نمائندہ ادیب ۱۲ ربیع الآخر سنہ ۱۴۰۶ھ کو اپنے ساتھ علم ، ادب ، نظر ، ثقافت ، ذہانت ظرافت حلم تحمل خوش خلقی غمگساری کا ایک تابناک باب لے کر اس بے مروت دنیا سے رخصت ہو گیا ، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ لیکن ہمارے درمیان اپنی علمی قلمی اور صحافتی یادگار کے طور پر کچھ منتشر اوراق اور خلف رشید مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی صورت میں ایک محرک فعال اور علم و ادب کا نمائندہ وجود چھوڑ گیا جو مرحوم کے آبدار ماضی کی یاد دلاتے رہیں گے اور اپنے دامن میں چھپائے ہوئے مرحوم کی تفویض کردہ ادبی اور صحافتی قندیلوں سے عالم ناسوت کے گلیارے روشن کرتے رہیں گے ۔

۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء، ۱۳ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ، ۶ مگھر ۱۹۰۷ شاکا، ۳۰ کارتک ۱۲۹۳ فصلی، ۱۲ مگھر ۲۰۴۲ بکرمی، ۱۲ مگھر ۱۳۸۹ بنگلہ بدھ کا دن، جو زندگی اور موت کے یدھ کا دن تھا، حیات و ممات میں جنگ ٹھنی ہوئی تھی، زندگی اور موت کے کارزار میں صف بندوں کی لڑائی جاری تھی — معمول کے مطابق آج بھی سورج طلوع ہوا اور پھر غروب بھی ہوا، لیکن اس تاریخی دن ایک آفتاب علم و ادب بھی غروب ہو گیا، صحافت کے آسمان سے ایک درخشاں ستارہ بھی ٹوٹ گیا — مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر جو گذشتہ آٹھ مہینوں سے سخت موذی مرض سے نبرد آزمائی کر رہے تھے اپنی عمر بھر کی بے قراری کے بعد آخر قرار پا گئے اور اس جہانِ فانی میں زندگی مستعار کے دکھ درد، غموں اور کلفتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئے۔

کہنے کے لئے یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا، روز ہی بنی نوع انسان پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں، اس میں کوئی نئی بات نہیں، لیکن مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر ایک ایسے عہد ساز انسان تھے جن کے وصال سے ایک علمی دور ایک ادبی عہد بھی ختم ہو گیا۔

کہنے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم روشن عقائد سے عبارت ہیں، لہذا ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہم بچھڑنے والوں سے یوم قیامت میں پھر مل سکیں گے، انھیں پھر دیکھ سکیں گے، لیکن ایسے عہد ساز اور عظیم المرتبت سالارِ ادب کے اس طرح بے وقت اور ناگہانی کوچ سے اردو علم و ادب نوازوں میں صفِ ماتم بچھ گئی، چاروں طرف سناٹا طاری ہو گیا۔

ہم شخصیت پرست نہیں ہیں بلکہ اہل کمال کے کمال فن کے مداح اور معترف ہیں، مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر ایک روشن دماغ انسان تھے، مسائلِ حاضرہ پر انھیں پوری پوری دسترس حاصل تھی، نثر بھی بڑی بے داغ قسم کی لکھتے تھے، بنی نوع انسان سے بلا امتیاز مذہب وملت انھیں بے حد محبت تھی، انسانیت پرست تھے۔

پندرہ روزہ "اشاعتِ حق" دیوبند کے ، فروری ۱۹۸۶ء میں ان کا وہ اداریہ شائع ہوا ہے جو انھوں نے ۱۹۷۳ء سال کے شروع میں تحریر فرمایا تھا، اس میں انھوں نے فلسفۂ حیات وحمایت ملت پروری، خیر سگالی سے شرابور الفاظ میں اپنے نادر خیالات کا اظہار اس طرح فرمایا تھا۔

"عجیب بات ہے کہ وقت جوں جوں آگے بڑھتا ہے اسی طرح انسانی زندگی گھٹتی اور کم ہوتی ہے مگر انسان عجیب فریبِ نفس میں گھرا ہوا ہے کہ ایک مہینہ ختم ہو کر دوسرا مہینہ اور ایک سال گذر کر دوسرا سال شروع ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ہماری عمر بڑھی ـــ بہرحال عمر گھٹے یا بڑھے وقت کو اسی طرح گذرنا اور زندگی کو یوں ہی آگے بڑھنا ہے ؎

کس کا خیال کون سی منزل نظر میں ہے
صدیاں گذر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

۷۲ء اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ ختم ہوا اور ۷۳ء اپنی جدت آرائیوں اور عشوہ آفرینیوں کے ساتھ سامنے کھڑا ہے اور ہم اس نووارد مہمان کا استقبال کر رہے ہیں۔

خبر نہیں کتنی امیدیں، کتنی آرزوئیں اور کتنے ارمان ہیں جو ۷۳ء سے وابستہ ہیں، کاش اس سال ویت نام میں پائیدار امن قائم ہو، فلسطینی مسلمانوں کو امن نصیب ہو، ممالک عرب توانائی اور ہوشیاری کی کروٹ لیں، ہندوستان پاکستان میں امن دوستی کے جذبات پیدا ہوں، امریکہ اور روس بڑی طاقتوں کی حیثیت سے انسانی زندگی کے لئے اپنے فرائض کا پاس کریں، ہمارا ملک اپنی ترقیات میں کامیاب ہو، اور ہمیں غریبی وبے روزگاری سے نجات ملے، ہم ان پرشوق تمناؤں کے ساتھ نئے سال کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اپنے ملک اور پوری انسانیت کو نئے سال کی

مبارکباد دیتے ہیں۔"

جناب عتیق احمد صدیقی نے ان الفاظ میں ایسے عظیم و باکمال فنکار کے لئے عقیدت کے پھول چڑھائے۔

"آہ! ادب وصحافت کا سورج غروب ہوگیا۔ ۲۷ر نومبر ۸۵ء کو تیسرا پہر کتنا منحوس تھا جب ہمارے درمیان سے ہمارے دل کی دھڑکنوں اور قلم کے بے تاج بادشاہ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زمین کے آغوش میں چھپادیا گیا،

حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اپنے قلم اور اپنی تحریروں سے سیاست وادب دین اور مذہب کی جو خدمت کی اس سے وہ ہزاروں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے تھے، انھوں نے اپنے آپ کو ملّت، مذہب اور اردو کی خدمت کے لئے وقف کردیا تھا، وہ ۶۵ رسال کی عمر میں آٹھ ماہ کی طویل ترین اور سخت بیماریوں کے باوجود لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے، ماہنامہ طیّب آپ کی ادارت میں آخر وقت تک شائع ہوتا رہا، آپ کی کئی تصانیف ہیں اور کئی کتابوں کے مسوّدے وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں، ان کے چلے جانے سے ادب وصحافت کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر نہ ہو سکے گا۔

انسانی زندگی پانی کا بُلبلہ ہے لیکن صفحۂ ہستی پر ایسے لوگ بھی نمودار ہوتے ہیں جن کے اُٹھ جانے سے ایک دنیا ویران اور سنسان ہو جاتی ہے۔" وغیرہ

اپنے شفیق والد کی یاد میں ان کے دل بند جناب سید نسیم اختر شاہ قیصر کے دل پر کیا بیتی وہ ان الفاظ سے ظاہر ہے۔

۲۷ر نومبر ۱۹۸۵ء کو ہمارے لئے اور اردو ادب کے لئے ایک ایسا سانحہ پیش آیا جس کو بیان کرنے پر نہ دل قابو میں ہے اور نہ قلم، والد مرحوم مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر اپنی آٹھ ماہ کی طویل ترین بیماری کے بعد اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف سفر کر گئے، اس طرح سے آٹھ مہینے کی بے قراری، بے چینی، اضطراب تڑپ سب کچھ ختم ہوگئی، راتوں کا جاگنا، دنوں کی بھاگ دوڑ، صبح وشام دوائیوں

کا سلسلہ، اب کرنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں رہا، شاعر کے قول کے مطابق ہمارا یہی حال ہو گیا ہے ؎

بس آج چین سے تیمار دار سو جائیں
مریض پھر نہ کہے گا سحر نہیں ہوتی

مگر چین کہاں، سکون کس کو، اطمینان کس کے پاس، کون مطمئن ہو سکتا ہے اور کون پاؤں پسار کر سو سکتا ہے؟ وہ چلے گئے مگر دل اور روح کی گہرائیوں میں غم کا جو طوفان اتار گئے وہ کہاں سونے دیگا وہ کہاں اس قابل چھوڑ گئے ہیں کہ مطمئن ہو سکیں، ان کی جدائی کا غم جسم میں دوڑتے ہوئے لہو کی ایک ایک بوند میں رچ بس گیا ہے، ان کو کیسے بھلائیں اور کیسے فراموش کریں۔"

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر نے اردو میں اپنا سب سے پہلا مضمون معروف اخبار "زمیندار" میں لکھا تھا، حالانکہ یہ ان کی کچی عمر کی تخلیق تھی جسے تجربات زمانہ اور علمی بصیرت کی آنچ درکار تھی لیکن ہونہار لاڈلے کے پاؤں پالنے ہی میں پہچان لئے جاتے ہیں، چنانچہ ظفر علی خاں جیسے پختہ کار ادیب اور شاعر نے یہ اندازہ لگالیا کہ جو لڑکا نو برس کی کم عمری میں ایسا مضمون لکھ سکتا ہے وہ ضرور آگے چل کر مینارِ صحافت کے کنگورے پر جلوہ افروز ہو سکتا ہے، یہ مضمون مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کے ادبی سفر کی انتہائی نیک اور مبارک فال تھی، چنانچہ اٹھارہ انیس برس کی عمر سے انھوں نے باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا، اور تقریباً پچاس سال تک وہ اردو علم و ادب، دین و مذہب، سیاست و ثقافت پر انتہائی مستند مضامین لکھتے رہے، ان گرانقدر مضامین نے ملک کے کونے کونے میں اور بیرون ملک بھی ان کی دھوم مچا کر رکھ دی، غیر منقسم ہندوستان میں ان کے بیش قیمت رشحات قلم ملک کے معروف اور مؤقر جرائد میں باقاعدگی سے منظر عام پر آتے رہے، ملک کا عظیم المیہ اس کی تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا اور اردو جو وطن میں شہزادی کی طرح راج کر رہی تھی اب ایک لونڈی اور باندی بنادی گئی، مولانا اردو کے ان وفا شعاروں میں تھے جو تقسیم وطن کے بعد بھی جلاوطن زبان اردو سے رشتۂ وفا نبھاتے رہے اور ساری عمر عزیزاسے سینے سے لگائے رہے۔

ایک جادو تھا جو وہ اپنے قلم سے جگا رہے تھے، پورے پچاس برس وہ اردو علم و ادب کی بے لوث خدمات انجام دیتے رہے، اور اب جب ان کا ادبی سفر اختتام کو پہونچا تو ہزاروں بیش قیمت

مضامین ومقالات اپنے پیچھے اپنی یاد کو برقرار رکھنے کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔

ان کے قلمدانِ ادارت سے بیش بہا رسائل وجرائد شائع ہوتے رہے، مثلاً صداقت سہارنپور، انوار دیوبند، دارالعلوم دیوبند، طیب دیوبند وغیرہم، جو رسائل وجرائد ان کی زیرِادارت شائع ہوئے وہ ایک نقشِ مکمل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اپنے زمانے کے معروف ترین جرائد تسلیم کئے جا چکے ہیں۔

وہ منفرد اسلوب کے مالک تھے، ایک مشاق صحافی تھے، جہاں جہاں ان کی تحریر کی روشنی پہونچتی تھی وہاں وہاں ہر اہلِ نظر ان کا مداح ومعترف ہو جاتا تھا۔

اپنے لائق اور قابل والد حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی طرح ان میں بھی ذہانت کوٹ، کوٹ کر بھری ہوئی تھی، حافظہ بھی ان ہی جیسا پایا تھا، برسوں کی بات کو اس طرح بیان کر دیتے تھے جیسے ابھی کل کا واقعہ ہو، حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کو امام العصر کہا جاتا تھا، انھیں کی طرح ان کے بڑے بیٹے یعنی مولانا سید ازہر شاہ قیصر بھی ایک بے مثل اور نادر ہستی ثابت ہوئے، موصوف کو مطالعہ سے عشق تھا اور ان کا مطالعہ ہمیشہ بڑا گہرا اور بھرپور ہوتا تھا۔

اردو کے مصنفین شعراء اور ادباء اور چوٹی کے فنکاروں میں وہ بے حد عزیز تھے ان کے مداحوں میں جگر مرادآبادی، احسان دانش، سیماب اکبرآبادی، روش صدیقی، شورش کشمیری، مولانا محمد عثمان فارقلیط، ناز انصاری، انور صابری، سالک، کریمی الاحسانی، وشوانا تھ طاؤس مولانا عبدالحق وغیرہم شامل تھے۔

سیاسی قائدین میں مولانا ظفر علی خان، شیخ محمد عبداللہ، مرزا افضل بیگ وغیرہم ان کی خدمات کے معترف تھے ــــ اپنے زمانے کے ممتاز ترین علماء سے بھی ان کی قربت رہی، مثلاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا محمد چراغ صاحب وغیرہم۔

ان کی تصانیف "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" "متفرقات"، "حیاتِ انور" "سفینۂ وطن کے ناخدا" "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" وغیرہم ان کی دائمی شہرت کی ضامن ہیں۔

شعر وسخن کے میدان میں ان کی غزلیات منظومات اور نعتیں انھیں زندہ رکھنے کیلئے کافی ہیں۔

بڑی حسین شخصیت کے مالک تھے. آواز بلند تھی مگر لہجہ انتہائی دلکش، سنجیدہ مزاج ضرور تھے مگر بات بات میں لطیفوں کے شگوفے چھوڑتے رہتے ہمیشہ چہرے پر شگفتگی رہتی تھی، بے حد خوش اخلاق انسان تھے، اپنے سے کم کو اپنے برابر سمجھتے تھے. برابر کے لوگوں کو خود سے بہتر سمجھ کر ان کی عزت کرتے تھے، بڑوں کا احترام تو کرتے ہی تھے

اکثر ایسا دیکھا گیا ہے جو انسان جتنا زیادہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے پاس اس کے گھر والوں کے لئے وقت ہی نہیں بچتا ہے، کبھی کبھی آدمی چڑچڑے مزاج کا بھی ہو جاتا ہے، مگر وہ زندگی بھر کسی سے بد مزاجی سے پیش نہیں آئے، خاندان کے ہر فرد کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھتے تھے، اپنے علمی مشاغل کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود اپنے خاندان کے افراد کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، مقام شکر ہے کہ ان کی یہی خصوصیات ان کے دل بند سید نسیم اختر شاہ قیصر میں بھی بعینہٖ موجود ہیں.

دراصل مولانا سید ازہر شاہ قیصر محض ایک فرد نہیں بلکہ مجسم ادارہ تھے، وہ اردو علم و ادب کا ایک عہد تھے، اردو صحافت کا ایک دور تھے، وہ یوپی اردو اکاڈمی کے ممبر بھی تھے ضلع وقف کمیٹی کے صدر بھی تھے اور بیشتر علمی ادبی اور سیاسی انجمنوں سے نہ صرف گہری طرح وابستہ ہی تھے بلکہ ان کی تقریریں بھی نشر ہوتی رہتی تھیں

ان کی کچھ تحریروں سے ان کی استعداد علمی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے جیسے:

"سچ یہ ہے کہ اردو کو سنبھالنے اور اس کو ترقی و توسیع دینے میں حکومت اترپردیش نے کافی حصہ لیا ہے، ہیم وتی نندن بہوگنا کے زمانۂ وزارت میں اترپردیش میں ساڑھے تین ہزار اردو ٹیچر اسکولوں میں رکھے گئے، اب بھی چھ ہزار ٹیچر پرائمری اور جونیئر اسکولوں میں رکھے جانے کی تجویز ہے جس میں کچھ حکومت کی ڈھیل اور کچھ ہر ضلع کے بیسک شکشا ادھیکاریوں کے متعصبانہ اور مخالفانہ رویے کی وجہ سے تاخیر پر تاخیر اور امیدواروں کے لئے سخت الجھنیں پیش آ رہی ہیں، لیکن امید رکھنی چاہئے کہ جلد ہی یہ مسئلہ طے پا جائیگا، حکومت نے اکثر صوبوں میں اردو اکاڈمیاں قائم کی ہیں ان کے لئے بڑی بڑی رقمیں امدادی طور پر منظور کی ہیں مگر اخبارات میں اکثر ان اکاڈمیوں کی کارگذاری کے متعلق شکایات ہی آتی رہتی ہیں.

مجھے بڑی شکایت اس وقت ۶ ہزار ٹیچروں کے تقرر کے سلسلہ میں اکاڈمی سے ہے اکاڈمی نے مسٹر نرائن دت تیواری کو اپنے یہاں بلاکر ان کے سامنے ایک لمبا چوڑا میمورنڈم رکھ دیا، بیگم حامدہ حبیب اللہ نے ایک تقریر کر دی، بس اتنی کارروائی پر بیٹھی ہوئی، حالانکہ اردو ٹیچروں کا مسئلہ بڑی دوڑ دھوپ کا طلبگار تھا

ان کی تحریروں کے چند دلکش نمونے اور دیکھئے۔

"جس طرح سونے کو کندن بنانے کے لئے اسے دیر تک بھٹی میں تپانا اور کوٹنا ضروری ہے ٹھیک اسی طرح انسانیت اور شرفِ انسانیت کی تکمیل کیلئے یہ لازمی اور لابدی امر ہے کہ انسان مہالک و موبقات کے ان تمام پُرخطر راستوں سے گذر کر جن کے قدم قدم پر کانٹوں کے جھاڑ انسان کے ناپاک خواہشات کے دامن ہستی کو چاک کر دینے پر تلے رہتے ہیں اپنے کو راضی برضائے مولا کے مرتبۂ بلند تک پہونچائے۔

انسانیت اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے نئی نئی تجویزیں سوچنے اور نئی نئی تحریکیں پیدا کرنے کا نام ہے اور نہ اچھا کھانے، اچھا پہننے، تھوڑا کام اور زیادہ آرام کرنے اور اپنی نگاہوں کو اس تیرۂ خاکدان اور اس کی بے اصل دلچسپیوں میں گم کر دینے کو کہا جاسکتا ہے بلکہ انسانیت ایک سرِ پنہاں ہے، قربانی نفس کا ایک راز ہے اپنا سب کچھ لٹا کر اللہ بالا و برتر کی رضا و خوشنودی کی تحصیل کا ....

"مسلمان جب مرے تو سولی کا ایک تختہ اور پھانسی کا پھندہ، نیزہ کی انی، شمشیر دسناں کی نوک بندوق کی نال اور بم کا گولہ یہ سب اس کے ارد گرد ہوں"

"ہندوستان میں خلافت اسلامیہ کی تحریک شروع ہو گئی، انگریز اور اسکے اتحادی ترکی اور جرمنی کے ساتھ نبرد آزما تھے اور پوری جنگی اور سیاسی جدوجہد یہ تھی کہ ترکی کو تباہ و برباد کر کے خلافتِ اسلامیہ کے ڈھانچے کو توڑ دیا جائے، اس تحریک کے سربراہ تو محمد علی اور شوکت علی تھے جنھوں نے نہایت جانبازی کے ساتھ اس تحریک کو منظم کیا اور لمبی لمبی قیدیں اس سلسلہ میں کاٹیں، نثار احمد کانپوری، محمد فاخر الہ آبادی ظفر علی خاں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام محمد مجدد سندھی، شیخ عبدالمجید سندھی

عطاء اللہ شاہ بخاری، حبیب الرحمٰن لدھیانوی، عبدالقادر منصوری یہ سب حضرات اس تحریک میں شامل تھے، دیوبند نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور اس کی فضا ؎

بولی اماں محمد علی کی ؛ جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ساتھ ہیں تیرے شوکت علی بھی ؛ جان بیٹا خلافت پہ دے دو

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۶ء تک مسلمان صرف قید و بند کا شکار ہی نہیں ہوئے بلکہ انگریزوں نے تہس نہس کرنے کی کوئی تدبیر باقی نہیں چھوڑی، بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرکے رنگون بھیجا گیا جہاں تیموری سلطنت کے اس تاجدار نے لکڑی کے ایک بوسیدہ سے مکان میں سسک سسک کر جان دی اور خود ان کا یہ قول سچ ثابت ہوا کہ ع دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں۔

تیموری شہزادوں کے سر طشت میں رکھ کر بہادر شاہ کے سامنے پیش کئے گئے قلعۂ معلیٰ کی بیگمات اور شہزادیاں اپنی عصمت و عفت بچانے کے لئے قصبات اور دیہات میں جا چھپیں، اور خوشحال گھرانوں میں ماماؤں کی حیثیت سے انھوں نے اپنی زندگی گذاری، ہزاروں مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط کی گئیں، ہزاروں زمینداروں کو نانِ شبینہ کا محتاج بنا دیا گیا۔

مولانا ظفر علی خاں نے کم و بیش ۱۷ برس کی قید کاٹی۔ ایک دفعہ مولانا منٹگری کی جیل میں تھے کہ ان کا عزیز پوتا منصور علی خان ان سے ملنے کے لئے جیل میں گیا مولانا کس پدرانہ شفقت، کس حسرت اور کس مجبوری کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ؎

مجھ سے ملنے کے لئے زنداں میں منصور آ گیا ؛ ڈھونڈتی تھیں جس کو نظریں چشم بد دور آ گیا

اس کا رونا اس کا ہنسنا اسکی شوخی اسکی ضد ؛ مجھ کو اختر ترے بچپن کا دستور یاد آ گیا

. . . . . . یہاں ہمیں مشہور محب وطن اشفاق اللہ خان کی بھی یاد آئے گی جو کاکوری سازش کیس میں گرفتار ہو کر فیض آباد جیل میں رہے اور وہیں انھیں پھانسی دی گئی، یہ پنڈت رام پرشاد بسمل، ٹھاکر روشن سنگھ اور راجندر لہری

کے ساتھی تھے اور حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار تھے۔ ....

۲۰ ستمبر ۱۹۲۷ء کو اشفاق اللہ خان حسرت کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا اس حالت میں کہ قرآن شریف ان کے ہاتھوں میں تھا اور آیاتِ قرآنی وردِ زبان تھیں، پھانسی پانے سے کچھ پہلے اشفاق اللہ خاں حسرت نے ایک شعر کہا تھا ؎

تنگ آکر ہم بھی ان کے ظلم اور بیداد سے ؛ چل دیئے سوئے عدم زندانِ فیض آباد سے

پھانسی کی کوٹھری میں اکثر اپنا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

وطن ہمیشہ رہے شاد کام اور آزاد ؛ ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے

ایک شعر ان کے جذبۂ حب الوطنی کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ ؎

کچھ آرزو نہیں ہے ہے آرزو تو یہ ہے ؛ رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں

؎ دنیا میں ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں انسان آباد ہیں مشرق اور مغرب کے آخری سروں تک انسان پٹے پڑے ہیں، کسی ایک شخص کا ان سب تک پہونچنا محالات سے ہے لیکن بیسیوں پچیسیوں اور سیکڑوں آدمیوں کو میں نے دیکھا ہے ان کے چہروں کو پڑھا ہے، ان کے ظاہر کا جائزہ لیا ہے، میں سوچتا ہوں اور سوچتے سوچتے میری عمر گذر گئی کہ وہ شرفِ انسانیت جس نے انسان کو ساری مخلوق پر برتری بخشی تھی کہاں گم ہوگیا، انسانیت کہاں گئی انسان کہاں مرگیا، میری موت کہاں گئی جو میرے اور اس دنیائے دنی کے درمیان ایک فاصلہ، ایک بُعد اور ایک حجاب پیدا کردیتی ؎

طولِ رہِ حیات سے گھبرا گیا ہے دل

اے موت آبھی جا کہ ترا انتظار ہے ؎

؎ افسوس ہے کہ ہندو مسلمانوں کے ذہن کا یہ بعد آج تک بھی ختم نہیں ہوا اور انھوں نے اب تک اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور اس کے استحکام کے لئے یہاں کی سب قوموں میں اتحاد و یک جہتی کا ہونا لازمی ہے۔ بہت موٹی سی بات ہے جو ہر شخص کی سمجھ میں آجانی چاہیئے کہ ایک گھر کے افراد آپس ہی میں لڑیں گے اور آپس ہی میں اپنے گھروں کے ساز و سامان اور اس کے مختلف عمارتی حصوں کو منہدم

کرتے چلے جائیں گے تو مکان کیسے باقی رہے گا اور اس کا ساز و سامان کیسے بربادی سے بچا رہے گا۔"

اگر میں مولانا سید ازہر شاہ قیصر کی تصانیف سے مزید اقتباسات پیش کروں تو یقیناً یہ مقالہ بہت طویل ہو جائے گا، لہٰذا اتنے ہی اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں، مگر ان اقتباسات سے مولانا کا زورِ قلم، ان کا طریقۂ استدلال ان کے اسلوب کی دل کشی، اظہارِ مطالب کے لئے ان کا دل نشین لہجہ اور ان کی تحریر کی پُر تاثیری پر کافی روشنی پڑتی ہے، کہتے ہیں کہ ہر خدا رسیدہ کا ایک داغدار ماضی ہو سکتا ہے اور ہر گنہ گار کا روشن مستقبل ہو سکتا ہے، اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر قوم کا بھی ایک ماضی ہوتا ہے اور ایک مستقبل بھی، مولانا کو تاریخ پر کافی عبور حاصل تھا، ہندوستانی قوم کی تشکیلِ حیات میں مولانا نے خود ایک اہم رول ادا کیا تھا، وہ ان مصنفین میں سے نہیں تھے جو دور سے موجوں کا تلاطم دیکھ کر ان پر اپنے تخیل کی مدد سے کچھ لکھتے، وہ خود گہرے پانی کے بہاؤ میں گھس کر طوفان بداماں لہروں کو محسوس کر چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کی تحریر تاریخ کی خوشبو سے معطر نظر آتی ہے وہاں ان کے الفاظ بھی انتہائی پُر تاثیر ثابت ہوتے ہیں، وہ اپنے انشائیوں سے پوری ہندوستانی قوم کے جذبات اور وارداتِ دل کی ترجمانی کرتے ہیں، ان کا اظہار پُر تاثیر تو ہے ہی لیکن بڑا جاندار اور پُر وقار بھی ہے، وہ اپنے مطالب کی ادائیگی کے لئے جو طریقۂ تحریر میں استعمال کرتے ہیں وہ ان کی چابکدستی ہوشیاری اور عالمانہ انداز کو ظاہر کرتا ہے، یہ ان کا ایسا اہم اور قابلِ ستائش کارنامہ ہے جس سے نہ صرف ان کے انشائیوں میں چمک اور جان پڑ گئی ہے بلکہ مفہوم میں گہرائی بھی پیدا ہو گئی ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ اردو کے بے مثل انشاپرداز مہدی حسن کی طرح مولانا کے یہاں بھی حسن آفرینی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی اور اختصار آفرینی پیدا ہو گئی ہے، مولانا کی نثر میں حکیمانہ انکشافات اور نکتہ آفرینیاں ملتی ہیں جس پر تاریخ اور فلسفہ کا رنگ بھی چڑھا ہوا ہے۔

مولانا نے آنکھیں اس فضا میں کھولی تھیں جب پورا ملک غلام تھا، ملک کو آزاد کرانے کیلئے مختلف تحریکیں اپنے پورے شباب پر تھیں اپنے غلام ملک کے لئے دردمندی کا جذبہ انھیں ورثے میں ملا تھا، انھوں نے غلام ہندوستان کی فضا میں سانس لی اور تلخ حالات سے تلخ کام بھی ہوئے۔ اس سے ان کے قلم کے مزاج میں ایک مخصوص کیفیت پیدا ہو گئی، ان کا شعور بیدار ہو گیا، وہ حالاتِ حاضرہ پر بڑی مہارت

سے قلم اٹھاتے ہیں اور اس طرح اٹھاتے ہیں کہ اس کا حق ادا کر دیتے ہیں، وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں، یہاں ان کا قومی شعور مکمل طور پر ابھر آتا ہے، انھوں نے قارئین کو بہت کچھ دیدیا یہاں تک کہ ان کے احسانات کا وزن محسوس کیا جاسکتا ہے، انھوں نے اردو سے ٹوٹ کر محبت کی اردو نثر پر انھیں بے پناہ عبور حاصل تھا وہ زبان کے صحیح استعمال سے واقف تھے، ان کے سحر آفریں اسلوب کی کرشمہ سازی اردو علم وادب کے شیدائیوں سے سدا ہی اپنا خراج وصول کرتی رہیگی۔

مرزا غالب نے اردو کو دل نشیں اسلوب بخشا تھا جس کے شاہد دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے ان کے خطوط ہیں جو مسجع عبارت سے قطعی بے نیاز تھے، مولوی محمد حسین آزاد نے اسی اسلوب میں نزاکت اور سادگی کی آمیزش کردی تھی، مولوی نذیر احمد نے اسی اسلوب کو متین بنادیا تھا، حالی اور شبلی نے اسے ایک نئی تہذیب کا قالب پہنادیا، اور ایک مخصوص شائستگی بخش دی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی اسلوب کو ندرتِ ذوق وفکر سے آراستہ کردیا تھا، منشی پیارے لال شاکر میرٹھی نے اپنی انشاپردازی کے جوہروں سے اس اسلوب کو انتہائی آبدار اور ستاروں سے زیادہ چمکدار بنادیا تھا، مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر نے اسی اسلوب کو ایک انوکھا لب ولہجہ اور اندازِ بیان بخش دیا تھا۔

انتہائی الجھے ہوئے معاملات پر بھی وہ اپنے مخصوص لہجہ میں اس طرح قلم آرائی کر جاتے تھے کہ تحریر میں الفاظ کا ربط ترتیب وقار اور انداز پڑھنے والے کے دل میں اترتا چلا جاتا اور اسکی روح تک کو سرشار کردیتا اور وہ مسحور ہو کر رہ جاتا تھا۔

تخلیقات میرے سامنے نہیں ہیں چند اشعار اور ایک سہرا جوان کی جولانی طبع کے ترجمان ہیں ضرور مجھے کہیں پڑھنے کو ملے تھے مگر طوالتِ مضمون کے خوف سے ان کی شاعری پر اپنے تاثرات کسی اور وقت بیان کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔

بہر حال مولانا ایک ہفت رنگ دانشور تھے وہ دورِ حاضر کے عظیم مصنف تھے جن کی تخلیقات میں ابدیت کا جوہر موجود ہے۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی موت سے علم وادب کے میدان میں واقعی ایک خلا پیدا ہوگیا ہے جس کے پورے ہونے میں یقیناً مدت درکار ہوگی۔

وقت کے بے رحم ہاتھوں سے کون محفوظ رہ سکا ہے، اور کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ زمانے کی تلخیاں اس کے قریب سے ہو کر نہیں گذریں اور اس دنیا کے تنگی اور مجبوریوں سے بھرپور دن اس نے نہ دیکھے ہوں. بہت کم خوش قسمت ایسے ملیں گے جنھیں کوئی غم نہ ہو، کوئی فکر نہ ہو، لیکن یہی لوگ اس میں بھی مبتلا دکھائی دیں گے کہ انھیں کوئی غم نہیں کوئی فکر نہیں —— آخر ایسا کیوں ہے؟ —— اور یہی چیز ان کے لئے سب سے بڑا غم اور سب سے بڑا دکھ بن کر سامنے آکھڑی ہوتی ہے، اور جب ایسا ہے تو ہم بھی اس حال سے کیسے خالی رہ سکتے ہیں اور کیسے اپنے آپ کو زمانے کی نیرنگیوں سے بچا سکتے ہیں.

۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو جو حادثہ پیش آیا وہ غیر متوقع نہیں تھا، آٹھ ماہ کی سخت بیماری، کمزوری بیچارگی اور معذوریوں کا کیا نتیجہ ہو سکتا تھا، مگر حادثات کسی بھی شکل اور کسی بھی صورت میں رونما ہوں ان کا اثر قائم ہو کر رہتا ہے مگر قدرت ایسے انتظامات کر دیتی ہے کہ آدمی اس کو ماننے اور تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے.

بلاشبہ بحالتِ شعور لگ بھگ ۱۲ ر ۱۴ برس مجھے ان کو دیکھنے کا موقعہ ملا، ہر موقعہ اور ہر وقت ان کے ساتھ رہنے اور آنے جانے کا اتفاق ہوا. مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کس دن اور کب انھوں نے مجھے اپنا مضمون پہلی بار نقل کرنے کے لئے دیا تھا، اور یہی وہ دن تھا جب قلمی میدان میں ان کی اور میری پہلی ملاقات تھی، میری تحریر کچھ صاف تھی اس لئے انھوں

نے اپنا ایک مضمون جو شاید باہر روانہ کیا جانے والا تھا مجھے دیدیا، میں نے اس کو نقل کر کے والد صاحب کی خدمت میں پہونچا دیا، چند جگہ صحیح کیا اور مطمئن ہو کر سپرد ڈاک کر دیا، اس کے بعد تو مضامین اور تقاریر کی نقل کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی گنتی ہر روز تقریباً مضمون خود لکھتے یا بول دیتے، دونوں صورتوں میں نقل کرنے کی ذمہ داری میری ہی ہوتی، میں بھی بڑی مستعدی کے ساتھ اور دلچپسی سے ان مضامین کو نقل کرتا، پھر سلسلہ آگے بڑھا، تو ڈاک بھی میرے ہی سپرد کر دی، اکثر خط و کتابت میں ہی کیا کرتا، وہ لکھتے تو خود بھی بہت تھے مگر مراسلت کا لمبا چوڑا سلسلہ تھا اس لئے کچھ کام اس ضمن میں میرے بھی ذمے ہوتے، قریب سے قریب رہنے کے اتنے مواقع مجھے ملے کہ میں یہ بھول گیا کہ وہ میرے والد ہیں، ان کے مشورے ان کی نصیحتیں، کام کرنے کے مختلف انداز، ہر معاملے میں ان کی رائے میرے شامل حال ہوتی اور یہ سلسلہ یوں اور بھی دراز ہوا کہ ۱۹۷۳ء میں میں نے اپنی زندگی کا پہلا مضمون لکھا، ڈرتے ڈرتے اصلاح کی غرض سے ان کی خدمت میں پیش کر دیا بمشکل ایک دو جگہ کاٹ چھانٹ کی اور مضمون مجھے واپس کر دیا، اس دن سے وہ لکھتے میں نقل کرتا، میں لکھتا وہ اصلاح دیتے، زندگی کا کارواں آگے بڑھتا رہا، وہ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی تھے، گھنٹوں بیٹھ کر سوچنا، خاکہ بنانا، ابتدا اور انتہا کی فکر میں پڑنا، یہ سب ان کے یہاں نہیں ملتا، بس قلم اٹھایا تو ابتدا بھی ہو گی، انتہا بھی ہو گی، نفس مضمون بھی خود بن جائیگا، الفاظ بھی خود بنتے اور سنورتے چلے جائینگے اور ایک گھنٹہ بعد معلوم ہوتا کہ دماغ کی گہرائیوں سے ایک تخلیق بن کر سنور کر صفحات کے سینے پر اپنی جگہ بنا چکی ہے، بس اٹھتے بیٹھتے، صبح و شام، دن اور رات ہم نے انھیں لکھتے ہوئے دیکھا نہ معلوم کتنے مضامین انھوں نے لکھے جو اخبارات و رسائل ہمارے پاس محفوظ ہیں اور جتنے ذخیرے کو ہم حاصل کر سکے ہیں اس کے اعتبار سے ان کے مضامین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے اور وہ چیزیں جو ابھی تک ہمیں حاصل نہیں ہو سکیں ان کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

پسندیدہ موضوعات :-

ان کا قلم ہر موضوع اور عنوان پر اپنے کمالات کے جوہر دکھاتا مگر چند موضوع ایسے تھے جن میں خاص طور پر ان کو لکھنے اور تحریر کرنے میں ملکہ حاصل تھا، دینی ادبی موضوعات پر ان

کا قلم بڑی روانی اور بڑی چابکدستی کے ساتھ چلا کرتا تھا، الفاظ کا انمول انتخاب، جملوں کی پرکشش ترتیب، اظہارِ بیان کی ندرت یہ تمام چیزیں ان کے مضامین میں نمایاں نظر آتیں، اور اپنے مافی الضمیر کو وہ بہت خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ لیکن زندگی بھر جو موضوع ان کو سب سے زیادہ پسند رہا وہ شخصیات کا تھا، اکابر کا تذکرہ، اسلاف کی داستانیں، بزرگوں کے واقعات بڑوں کی پاکیزہ زندگیاں اور اپنے دور کی علمی، دینی، مذہبی، سیاسی، سماجی، ادبی نادرۂ روزگار ہستیوں کے ذکرِ خیر کو وہ زیادہ پھیلاتے اور بتاتے، کسی بھی شخصیت کو جانچنے اور پرکھنے کا ان کا اپنا ایک انداز تھا اور جو ان کے اس انداز اور معیار پر پورا اترتا اس کے کمالات اور خصائص کو سامنے لانے میں وہ بہت زیادہ دلچسپی دکھاتے، یہی وجہ ہے کہ شخصیات پر لکھے گئے ان کے ہزاروں مضامین ہر حلقہ اور ہر طبقہ میں یکساں طور پر مقبول ہوئے اور شخصیات کے خاکوں اور حالات سے دلچسپی رکھنے والوں نے انھیں انمول شاہکار قرار دیا، ان کے طویل تر مضامین ملک کے اکثر اخبارات و رسائل میں شخصیات پر آتے رہتے اور اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کرتے، جیسا کہ لکھ چکا ہوں کہ وہ ہر موضوع پر بلا تکلف اور بغیر مشکل کے لکھنے میں مہارت رکھتے تھے، اسی وجہ سے ادبی، سیاسی دینی، مذہبی، سماجی، تاریخی، تحقیقی مضامین کی تعداد بھی بے شمار ہے۔

بحیثیت مُدیر :-

اپنی صحافتی اور قلمی زندگی میں انھوں نے کم و بیش چھ سات رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اور یہ تمام اخبارات و رسائل وہ تھے جو اپنے دور کے مؤقر اور علمی رسائل و جرائد میں شمار کئے جاتے تھے، اخبار صداقت سہارنپور میں انھوں نے برسہا برس مزاحیہ کالم بھی تحریر فرمائے جس میں بڑے خوبصورت انداز میں حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا تھا، تیکھے لب و لہجہ میں گرفت ہوتی اور مزاحیہ و ہلکے پھلکے انداز میں وہ بات کہہ جاتے جس کو کہنے کے لئے صفحات کے صفحات سیاہ کئے جاسکتے تھے، ان کا مزاحیہ کالم اس دور میں بے انتہا مقبول تھا جس کا ایک حلقہ بے چینی اور بے قراری کے ساتھ انتظار کیا کرتا، غرض کہ ہر صنف پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا، اور اس میدان میں خدا نے ان کو خاص صلاحیتوں سے نوازا تھا، دیوبند کی سرزمین پر وہ تنہا ایسے صحافی اور ادیب تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں اتنے پرچوں کی ادارت

کے فرائض انجام دیئے۔

ان کی مختلف باتیں

مزاج کے اعتبار سے وہ بہت نرم، خلیق اور ملنسار قسم کے انسان تھے، دارالعلوم دیوبند کی ۴۰، ۴۵ سال کی ملازمت کے زمانے میں ہزاروں افراد سے ان کا تعلق رہا اور ہزاروں افراد ان کے قریب رہے، تلخی اور ناگواری کے حالات اس درجہ کبھی پہونچے ہوں کہ انسان ایک دوسرے کی شکل دیکھنے تک تیار نہ ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا، رسالہ دارالعلوم میں ان کی لمبی چوڑی مجلسیں رہا کرتیں، درجۂ عربی کے چھوٹے بڑے اساتذہ، کارکنان، ادیب صحافی اور انشا پرداز سیاسی شخصیتیں سب ہی ان کے پاس آتے، گھنٹوں بیٹھے رہتے اور دنیا کے تمام موضوعات پر بحث ہوتی، اپنی اپنی رائے پیش کی جاتی، معاملہ طول پکڑتا اور ماحول بے انتہا سنجیدہ ہوجاتا تو والد مرحوم چند جملوں ہی میں محفل کو زعفران زار بنا دیتے، طبیعت میں فطری طور پر مسکراتے رہنا شامل تھا، اپنے قریب کے لوگوں کو مایوس اور اداس دیکھنا گوارہ نہ کرتے، ہر ممکن طریقے سے دلجوئی کرتے اور مسائل کے حل کی مختلف صورتیں پیش کرتے، رائے کے پختہ اور معاملات کی گہرائی تک ایک دم پہونچ جانے کی صلاحیت رکھتے تھے، اپنے قول وفعل کے دھنی تھے، اکابر واسلاف کے واقعات سامنے لانے اور ان سے ایک صحیح سمت کا تعین کرنے کا جذبہ ہمیشہ پیشِ نظر رہتا، خود بھی بزرگوں کی اداؤں کو سمو لینے کی کوشش کرتے اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنے کی تلقین ہوتی، کہیں کوئی بات ہوئی، کوئی مسئلہ پیدا ہوگیا، والد مرحوم اس کو اپنی دور اندیشی وبصیرت سے سلجھانے میں کامیاب رہتے، اپنے بڑوں کا احترام کرتے، ہم عمر لوگوں کے ساتھ بے تکلف ہوکر گفتگو کرتے اور چھوٹوں پر بے انتہا شفقت اور حوصلہ افزائی کا معاملہ کرتے، ۱۹۷۳ء میں جب راقم نے پہلا مضمون لکھا تو مجھ سے کچھ نہیں کہا، مگر قریب کے لوگوں کو اس کام پر مامور کردیا کہ اسے لکھنے کی تاکید کریں اور کہیں کہ اس سلسلہ کو ختم نہ کرے ابتدا میں دشواری تو ضرور ہوگی مگر محنت کی تو معاملہ آگے بڑھ جائیگا، اصلاح کا ایک خاص انداز تھا، نو آموز اور تحریر کے میدان میں ابتدائی قدم رکھنے والوں کو بھی ہلکے پھلکے انداز میں سمجھاتے اور ان کی تحریروں میں زیادہ کاٹ چھانٹ نہ کرتے، کہیں کوئی جملہ بدل دیا اور کہیں

کسی لفظ کا اضافہ کر دیا، آہستہ آہستہ جب یہ دیکھتے کہ اب یہ شخص چل پڑا ہے اور تحریر کی دنیا سے اس کی واپسی ناممکن ہے تو اب ان کے سمجھانے اور اصلاح دینے کے انداز میں فرق آجاتا۔۔۔ مختلف کتابوں کے مطالعہ کی تاکید ہوتی، اس طرح ذہن بنانے اور پھر ان سے کام لینے کی زبردست صلاحیت تھی، کسی کو مایوس کرنا اور حوصلہ شکنی کرنا ان کے مزاج میں داخل نہ تھا، ان کے قریب اٹھنے بیٹھنے والے لوگ ہر صورت اور ہر حالت میں اس کا اقرار کریں گے کہ ان کی ذات سے کسی کو ادنیٰ درجہ کا بھی نقصان نہیں پہونچا، ملازمت کی ۴۵ سال سے زائد کی زندگی میں ہر طرح کے آدمی سے واسطہ پڑا اور ہر فکر کے انسان سے ان کی دوستی اور تعلقات رہے مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے کسی دور میں اپنی ذات سے کسی کو تکلیف پہونچائی ہو یا پریشانی کا سبب بنے ہوں، اس دور میں بھی نہیں جب کہ مجلس شوریٰ کے ممبران اور بزرگ ان کا بے انتہا خیال کرتے اور بالفاظ دگر ان کے نخرے اٹھاتے تھے، وہ اگر چاہتے تو اپنے تعلقات اور ان افراد کی عنایات سے فائدہ اٹھا کر رسالہ دارالعلوم کی ادارت سے ہٹ کر کوئی اور عہدہ بھی حاصل کر سکتے تھے اور کسی کو بھی اس کے منصب سے محروم کرا سکتے تھے، مگر قدرت نے لالچ حسد اور بغض کی لعنت سے یکسر پاک رکھا تھا، مجلس شوریٰ کا آغاز ہوتا تو لوگ دوڑے دوڑے ان کے پاس آتے کوئی اپنی ملازمت کیلئے سفارش کراتا، کوئی اپنے استقلال کا خواہشمند ہوتا، اور وہ ان تمام لوگوں کے لئے ممبرانِ مجلسِ شوریٰ سے ملتے اور ان حضرات کے مسائل اور پریشانیوں کو دور کراتے۔

رسالہ دارالعلوم کی مجلسوں میں وہ حضرات تشریف لاتے تھے جن کو رب العالمین نے علم وعمل کی لازوال دولتوں سے نوازا تھا، اور جو اپنے اپنے طبقہ میں نمایاں اور منفرد حیثیتوں کے مالک تھے والد مرحوم کی رائے اور ان کی گفتگو قطعی اور آخری سمجھی جاتی، کوئی علمی مسئلہ ہوتا، بین الاقوامی سیاست کی بات ہوتی، ادب وصحافت کے کسی پہلو پر اظہار خیال ہوتا، تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی ہوتی وہ ہر موضوع اور ہر مسئلہ پر گفتگو کرتے اور بڑے مضبوط وٹھوس لب ولہجہ میں گفتگو ہوتی۔ وہ مجلسیں دارالعلوم کی زندگی کی یادگار مجلسیں سمجھی جائیں گی مگر آج نہ وہ افراد ہیں جو والد مرحوم کے ہم عصر تھے، کچھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، کچھ کو حالات نے جدا کر دیا، اور جو کچھ باقی ہیں ان کو حالات اور زمانے کے بدلتے تیوروں نے گم سم کر دیا ہے۔

کچھ گفتگو رسالہ دارالعلوم کے بارے میں ہو جائے۔ جس زمانے میں والد مرحوم کو رسالہ دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داریاں سونپی گئیں، اس وقت رسالہ دارالعلوم کا نہ کوئی وقار تھا اور نہ معیار، بڑے بڑے لکھنے والے اور صاحبِ کمال لوگ رسالے کی ادارت سے عاجز آکر اپنا دامن چھڑا چکے تھے، اور رسالہ دن بدن اپنی وقعت کھوتا جا رہا تھا۔ دارالعلوم جیسی مرکزی جگہ سے جس معیار کا پرچہ نکلنا چاہیئے وہ اس کو نہیں مل پا رہا تھا، والد مرحوم نے اس ذمہ داری کو اس طریقہ پر پورا کیا کہ مکمل ۴۵ سال نہایت شان، بڑے وقار اور بلند افکار کے ساتھ یہ پرچہ پوری دنیا میں دارالعلوم کا حقیقی ترجمان بن کر سامنے آیا اور صرف رسالہ دارالعلوم کی وجہ سے دارالعلوم نے ہزاروں لوگوں کو اپنے سے متعارف کرایا اور ہزاروں لاکھوں افراد اس کے حلقے میں شامل ہوئے، غرض کہ ان کا دورِ ادارت رسالے کی زندگی کا زرّیں دور رہا۔

سفر سے الجھن :-

اپنے کاموں میں بہت مستعد اور چاق و چوبند ہونے کے باوجود سفر کے بالکل عادی نہ تھے، ہر جہت اور ہر پہلو سے سفر سے دامن بچاتے، بہت مجبوری اور اصرار کے بعد اگر آمادہ بھی ہوتے تو کئی روز قبل اس طرح انتظامات شروع ہو جاتے جیسے کسی لمبے اور طویل سفر کی تیاریاں ہوں، حالانکہ سفر عموماً دہلی، سہارنپور، لکھنؤ، مظفر نگر اور کشمیر وغیرہ کے ہوا کرتے مگر ان تمام اسفار کو لندن و امریکہ کے سفر سے کم نہ سمجھتے۔ ان کے تمام تر تعلقات خط و کتابت پر منحصر تھے، ہزاروں ملنے جلنے والے ایسے رہے کہ جن کی شکل تک نہ دیکھی مگر خط و کتابت کے ذریعہ ان سے مضبوط اور خوشگوار تعلقات رہے، آل انڈیا ریڈیو دہلی کی دعوت پر اکثر تقریر کے لئے جانا ہوتا تو اس طرح کہ صبح دس بجے ریڈیو اسٹیشن پہونچے تقریر کی اور روانہ، دن کے دن دیوبند پہونچ جاتے اور کئی روز تک سفر کی تکالیف اور پریشانیوں کا ذکر کرتے رہتے، بڑی بڑی تقریبات اور پروگراموں میں شرکت صرف سفر کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو پاتی تھی بہت اصرار اور شدید تقاضوں کے بعد اپنے آپ کو تیار کر پاتے تھے، مجھے کئی اسفار میں ان کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملا، سفر میں خاموشی اختیار کرتے یا پھر مطالعہ میں مستغرق رہتے، ہر معاملہ کی طرح اسفار میں بھی اپنے مخصوص انداز میں رہتے، کشمیر کے سفر میں جو علامہ انورشاہؒ

کے سیمنار کے سلسلے میں ہوا بہت محنت اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ سیمنار ان کے والد صاحب کی خدمات اور کارناموں پر مشتمل تھا، پھر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں انھوں نے کئی ماہ اسفار میں گذارے، بے انتہا محنت کی، رات دن کاموں میں لگے رہے، اور مقام مسرت ہے کہ شدید ہنگاموں اور ابتلا کے دور میں بھی ان کی امانت و دیانت پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی، جب کہ اجلاس صد سالہ کے لاکھوں کے حسابات ان سے متعلق تھے اور زمین کی فراہمی کے سلسلہ میں ہزاروں روپیہ ان کے ہاتھوں خرچ ہوا۔

بیماری اور صبر :-

جن لوگوں کو والدِ مرحوم کی بیماری کے زمانے میں ان کے قریب رہنے یا ان کے پاس آنے جانے کا اتفاق ہوا وہ اس حقیقت کو دہرائیں گے کہ شاہ صاحب نے بے انتہا تکالیف میں اپنے آٹھ ماہ گذارے مگر اس پوری بیماری کے زمانے میں کوئی حرفِ شکایت ان کی زبان پر نہ آیا بیماریاں روز بڑھتی رہیں، جسم دن بدن کھوکھلا اور خالی ہوتا گیا، درد، ٹیس، کرب، بے چینی، اضطراب گھبراہٹ، تمام ہی چیزیں ایک ساتھ جمع ہیں مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا، پوچھنے والے پوچھتے کہ شاہ جی آج کیسی طبیعت ہے تو کبھی تکلیف کا اظہار نہ ہوتا بس ایک جملہ مخصوص تھا کہ آج طبیعت بہتر ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے بڑی بے چینی اور بے قراری میں اپنے اوقات گذارے مگر کبھی زبان پر ایک لفظ بھی ایسا نہیں آیا جس سے ان کی شدید بیماری کا احساس ہو، صبر اور خاموشی کو انھوں نے اپنے لئے اختیار کر لیا تھا اور آخر وقت تک وہ اس پر قائم رہے، ان کے صبر، خاموشی اور اللہ کی رضا میں راضی ہونے کا یہ مرحلہ خداوند کی ذات سے امید پیدا کرتا ہے اور یقین ہوتا چلا جاتا ہے کہ رب العالمین ان سخت آزمائشوں اور امتحانات میں ان کے صبر کے بدلے اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے اور ان کی بال بال مغفرت فرما کر بلند درجات سے نوازیں گے، خدا اپنا رحم فرما اور انھیں کروٹ کروٹ سکون اور چین نصیب فرما۔ آمین۔

امداد و تعاون کا جذبہ :-

دوسروں کے کام آنے، ان کے کاموں میں ہاتھ بٹانے اور مشکلات کو دور کرنے میں پوری دلچسپی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے، محلہ اور محلہ سے باہر کے نہ جانے کتنے ضرورتمند اور غریب

لوگ آتے اپنی پریشانیوں اور مجبوریوں کا اظہار کرتے اور والد مرحوم اپنے پاس سے یا دوسرے حضرات کے ذریعہ ان کی مالی امداد کیا کرتے، بہت زیادہ رقیق القلب تھے، حادثات سے بہت جلد متاثر ہوتے، چہرے پر ایک کرب سا آکر گذر جاتا، ایسے حضرات کی کہانی پوری توجہ سے سنتے جو غیر معمولی حادثات کا شکار ہوتے، بارہا ہم نے انھیں ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے دیکھا ہے اپنی ہر کوشش سائل کی ضرورت پوری کرنے میں لگا دیتے اور اس وقت تک مطمئن نہ ہوتے جب تک اس شخص کی خاطر خواہ مدد نہ کر لیتے، بہت سے گھر تھے جو ان کے تعاون سے ایک پرسکون اور مطمئن زندگی گذار رہے تھے، بہت سے خاندان ہیں جنھوں نے ان کے ذریعہ اپنی مالی پریشانیوں کو دور کیا، اور بہت سے ایسے افراد تھے جن کا اپنے حلقۂ اثر سے انھوں نے مالی امداد کا انتظام کیا۔

اب کہاں ایسے لوگ اور ایسا جذبہ رکھنے والے انسان جو دوسروں کی تکلیف پر بےچین ہو اٹھیں اور ان کی مجبوریوں کو اپنی مجبوری سمجھ کر دور کرنے کی کوشش کریں۔

معاملات:۔

جس شخص کے ہزاروں لوگوں سے تعلقات ہوں، صبح و شام ملنا جلنا ہو، انگنت لوگوں سے رسم و راہ ہو اور احباب کا ایک بڑا حلقہ ہو اس کے ساتھ دو چار ایسے واقعات کا ہو جانا کوئی بعید نہیں جس سے دوسرے لوگ اس کی دیانت و امانت پر شک کرنے لگیں، انھوں نے بڑے وقار اور بڑی شان کے ساتھ اپنا وقت گذارا، معاملات کے بالکل سچے اور صاف تھے، کسی سے قرض لینا، قرض لے کر واپس نہ کرنا، کسی کو پریشان کرنا یہ ان کی فطرت نہ تھی، قرض نام کی کوئی چیز ان کے قریب سے ہو کر نہیں گذری، ہزاروں لوگوں کے بڑی بڑی رقموں کے معاملات ان سے متعلق رہے مگر کسی کو بھی کوئی حرفِ شکایت زبان پر لانے کا موقعہ ملا ہو ایسا کبھی نہیں ہوا، قرض دے دیتے تھے، قرض لینے کی قطعی عادت نہ تھی، اپنے مسائل ہزار مجبوریوں کے ساتھ تنگی ترشی کے عالم میں ہر طرح خود ہی نمٹاتے تھے اور بسا اوقات نقصان اٹھا کر بھی دوسروں کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیتے تھے، مثال میں ایک واقعہ نقل کر دینا کافی ہوگا، رسالہ دار العلوم کا تین چار مہینے کے اندر ہزاروں روپے کا کاغذ آتا تھا جس کی رقم کی ادائیگی والدِ مرحوم کے

ہی ذریعہ ہوتی، آخری بار کاغذ آیا کچھ رقم ادا ہوگئی اور کچھ باقی رہ گئی۔ اتنے میں دارالعلوم کا کاروبار ہی الٹ کر رہ گیا، رقم پھنس گئی اور دارالعلوم میں داخل ہونے والے لوگوں نے یہ کہہ کر رقم کی ادائگی سے انکار کر دیا کہ یہ کاغذ ہم نے نہیں منگایا تھا اس لئے اس کی رقم ہم ادا نہیں کریں گے، کاغذی والدِ مرحوم کو ذمہ دار جانتا اور ان ہی سے رقم کا مطالبہ کرتا، آخر کار یہ رقم اس طرح ادا ہوئی کہ والدِ مرحوم نے خود اپنی جیب سے کئی قسطوں میں یہ روپے دیئے لیکن اس کاغذی کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ شکایت کا پہلو سامنے لائے یا بدگمانی کا شکار ہو، دوسرا واقعہ بھی لگے ہاتھوں سن لیجئے والدِ مرحوم رسالہ دارالعلوم کی روز سے آنے والی رقم گھر ہی پر رکھتے، جب دارالعلوم سے ان کا تعلق منقطع ہو گیا تو انھوں نے یہ تمام رقم حسابات کے ساتھ دارالعلوم میں جمع کرادی، اور یہ اس صورت میں تھا کہ دارالعلوم والوں نے کاغذ کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا، اگر چاہتے تو اس رقم کو کاغذی کو دیکر اپنا پیچھا چھڑا سکتے تھے مگر یہ ان کے اصول و معاملات کے خلاف تھا اس لئے ایسا نہ کر سکے۔

پیدائش اور ابتدائی حالات:-

۱۳۳۸ھ اواخر شعبان میں وہ دیوبند کے مشہور محلہ دیوان میں جس میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ابتدا میں قیام فرمایا تھا پیدا ہوئے، تاریخی نام منظفر حسین رکھا گیا، یہ دور حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی شخصیت اور کمالات کے عروج کا دور تھا، ان کی شہرت و عظمت کا چرچا پوری دنیا میں پھیل چکا تھا اور وہ علمائے دیوبند میں ایک بلند مرتبہ اور عظیم علمی شخصیت کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے، اسی علمی ماحول میں آپ کی پرورش ہوئی اور عمر کے تیرہ برس انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات میں گذارے، اولاً حفظِ قرآن کی سعادت سے مشرف ہوئے، حضرت امام العصرؒ کی حیات ہی میں رمضان کے مبارک مہینوں میں تین بار قرآن سنانے کا موقع ملا، پھر اپنے وقت کے مشہور اور نادرۂ روزگار عالموں علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا سید محمد ادریس صاحب کرودھوی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، ان حضرات نے پوری توجہ اور محنت کے ساتھ والدِ مرحوم کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ہاتھ بٹایا، مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا، شاہ صاحبؒ

کی وفات کے بعد نہ صرف تعلیمی سلسلہ ہی منقطع ہوا بلکہ ان کے ذہن و فکر کی دنیا ہی بدل گئی اور انھوں نے اپنی ذہنی اور فطری صلاحیتوں کو میدانِ تحریر میں آزمانے اور پروان چڑھانے کا فیصلہ کیا، اور یہیں سے مستقبل کے ایک بلند پایہ صحافی اور صاحبِ طرز انشا پرداز کی زندگی کا آغاز ہوا۔

سلسلہ آگے بڑھتا ھے:۔

لکھنا اور صرف لکھنا ان کی زندگی کا ایک اہم اور بنیادی مقصد بن گیا، انھوں نے اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے ہزاروں چراغ روشن کئے، صفحۂ قرطاس پر سوز میں ڈوبی ہوئی تحریریں اور عبرت و نصائح سے بھرپور مضامین اندھیروں اور تاریکیوں کے سینے میں ایک شمع بن کر اجالا کرتے رہے، کوئی موضوع ایسا نہ رہا جس پر قلم نہ اُٹھایا اور جس کا حق ادا نہ کر دیا ہو ابتدا ایک مختصر سی کوشش سے ہوئی اور انجام ہزاروں مضامین کی شکل میں سامنے آیا، اخبارات و رسائل میں بے تکلف لکھا، کوئی ایسا رسالہ نہ رہا جس میں آپ کا مضمون شائع نہ ہوا لکھنے کے میدان میں انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی، بس قلم کا سفر جاری رہا، وہ اداس راہوں پُر ہول ماحول رات کے سناٹوں شام کے اندھیروں اور ہزار وحشتوں کے درمیان اپنی ذہانت، فکر اور بلند خیالات کی روشنی بکھیرتے رہے، اپنے مضامین کے ذریعہ دین و مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کا فرض پورا کیا، اپنے والد مرحوم کی طرح انھوں نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت میں صرف کی اور اس کے لئے قلم کو ذریعہ بنایا وہ صالح اور مثبت اندازِ فکر کے ساتھ تمام مسائل کا حل پیش کرنے کے عادی اور ان کو سلجھانے کے خواہش مند رہتے، ٹکراؤ یا اختلاف کی پالیسی ان کے مزاج میں داخل نہ تھی، وہ ہر معاملے کی گہرائی میں پہونچتے اور وہاں سے ان چیزوں کو نکال کر لاتے جو مفید ہوتیں اور ان کی نشاندہی کرتے جو ضرر رساں ہوتیں، اس پاکیزہ مقصد کے تحت زندگی گذارنے اور تمام عمر صرف کر دینے والے انسان کی زندگی قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔

تقریر کے میدان میں:۔

تحریر کی دنیا میں وہ بلا شبہ خاص لب ولہجہ اور زبان کے مالک تھے مگر تقریر کی دنیا میں ان کا منفرد انداز تھا، آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ان کی کافی تقریریں نشر ہوئیں جو مختلف

موضوعات اور عنوانات پر مشتمل ہوتیں لیکن عوامی جلسوں میں بھی تقریر کا ایک خاص انداز تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی توجہ سے امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کی خدمات اور کارناموں کے اعتراف میں ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشد تلامذہ نے شرکت کی۔ لگ بھگ ایک ہفتہ تک وادی کشمیر ان حضرات کے علوم و کمالات سے مستفیض ہوتی رہی۔ والد مرحوم نے میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق بخاری کی خواہش پر جامع مسجد سرینگر میں جمعہ کے روز نماز سے قبل لگ بھگ ایک گھنٹہ اتنی جامع، پر مغز اور رواں دواں تقریر کی کہ ۲۵ / ۳۰ ہزار کا مجمع مسحور ہو کر رہ گیا۔ دوسری تقریر جو انھوں نے اس سفر کے دوران کی وہ درگاہ حضرت بل کے ہزاروں افراد کے مجمع کے سامنے کی اور یہاں بھی مجمع ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا پھر دوسرے مواقع پر بھی ان کی مختلف تقاریر سامنے آتی رہیں۔ جنتا پارٹی کے دور میں انھوں نے قرب و جوار اور آس پاس کے علاقوں میں سیاسی اسٹیج پر پہونچ کر عوام کو صحیح صورتِ حال سے مطلع کیا اور صحیح فیصلے پر پہونچنے کی دعوت دی۔

دیوبند انٹر کالج میں ان کی قومی یکجہتی کے موضوع پر کی گئی تقریر اس لئے یادگار مانی جائیگی کہ اس تقریب میں دہلی اور دوسرے مقامات سے اردو ہندی اور انگریزی کے مشہور اور نامور صحافی موجود تھے اور کئی سو صاحبِ علم اور صاحبِ کمال کی موجودگی میں والد مرحوم نے قومی یکجہتی کے موضوع پر جس طرح اپنے خیالات کا بے خوف ہو کر اظہار کیا وہ یقیناً دوسروں کے لئے ایک مشکل امر تھا۔

قصے، افسانے، کہانیاں :-

تحریر کی دنیا میں ان کے قدم پڑے تو دُور دُور تک اپنے نقوش چھوڑتے چلے گئے کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جہاں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کی گہری چھاپ نہ چھوڑی حتّٰی کہ افسانے، کہانیاں اور قصے بھی ان کے قلم سے نکلے، رسالہ " حور " لاہور اور رسالہ " سہاگ " وغیرہ میں ان کے یہ افسانے، کہانیاں اور قصے شائع ہوئے خاص طور پر ان کی اس انداز کی جو چیزیں پسند کی گئیں ان میں " دو عیدیں " " اسرار و بصائر " " ڈاکٹر " " انقلاب " شرابی " شاعر " غریب " آزادی " " بچے " ٹوٹا ہوا آئینہ وغیرہ کافی مقبول ہوئیں اور ان کو پسند کیا گیا، مگر فطری طور پر

چونکہ یہ آپ کا میدان نہ تھا اس لئے بہت جلد اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور دوسرے موضوعات کو اپنا لیا۔

پریشانیوں میں ان کا عمل

زندگی کی طویل ترین مسافت کے دوران انسان کو مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہوتے کہ پریشانیاں چاروں طرف سے گھیر لیتیں اور مسائل بالکل الجھا کر رکھ دیتے تو ان کی عبادت میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا، نمازیں پڑھتے، دعائیں مانگتے اور اپنے اللہ کے سامنے پوری عاجزی اور انکساری کے ساتھ گریہ وزاری کرتے، اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے، جدّ امجد کے مزار پر حاضری میں پابندی پیدا ہوجاتی، غرض کہ ایسی صورتوں میں جہاں انسان گھبرا اٹھتا ہے اور آسانی کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا ان کا ہمیشہ یہی عمل ہوتا اور ہم نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا اور ہزاروں بار ایسے نتائج ہمارے سامنے آئے کہ ان کی پریشانیاں اور دشواریاں یکدم ختم ہوتیں اور زندگی کا قافلہ پھر اسی رفتار اور حالت میں اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگتا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ پریشانیوں میں انسان اگر اپنے خدا کی جانب متوجہ نہ ہو اور اس سے لو نہ لگائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ہلاک ہونے اور رسوا ہونے سے نہیں بچا سکتی۔

آخری سفر

۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ بروز بدھ دن کے تین بجے انھوں نے اس دنیا کی رنگینیوں سے منہ موڑا اور اگلے دن صبح نو بجے ان کی تدفین عمل میں آئی۔

نو بجے والد مرحوم کے خاص دوستوں اور احباب کے ساتھ یہ جنازہ شاہ منزل سے روانہ ہوا، جامع مسجد دیوبند میں غیر معمولی تعداد میں موجود لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی، شہر کے سرکردہ افراد علماء فضلاء اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد جنازہ میں شریک تھی۔ ان کے انتقال کی خبر دارالعلوم (وقف) دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کے لاؤڈ اسپیکر سے پورے دیوبند میں پھیل گئی، کاندھوں سے کاندھوں پر ہوتا ہوا یہ جسد خاکی مزار انوری میں پہونچ گیا اور نو بجے پوری نصف صدی کی ایک پاکیزہ داستان، ایک مقدس کہانی، ایک غیر معمولی انسان، ایک بلند

فکر صبانی، ایک نمایاں ادیب، ایک منفرد لب و لہجہ کا انشا پرداز علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

جنازہ کے ساتھ ساتھ جہاں جہاں سے گذر ہو رہا تھا، جس طرف سے ہم آ جا رہے تھے یہ احساس دل کو چور کئے دے رہا تھا کہ ان راستوں اور ان راہوں میں والدِ مرحوم کے جسدِ خاکی کے ساتھ ہی سہی ہمارا یہ آخری سفر ہے، اور اب کبھی یہ موقع نہیں ملیگا کہ ہم ان کے ساتھ چند قدم چل سکیں، ان کی معیت میں راستہ طے کر سکیں، ان کی سرپرستی میں کسی سفر کی تکمیل کر سکیں، ہمیں اب تنہا ہی اس دنیا کا بار اٹھانا ہے، اپنی ضروریات اور مسائل کو خود ہی سلجھانا اور پورا کرنا ہے، اب ان کی رفاقت، ان کی مدد، ان کا تعاون ہمیں کبھی حاصل نہ ہو سکے گا، باقی رہنے والی ذات اللہ ہی کی ہے۔

یادِ رفتگاں

معروف صحافی ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم کی نذر

ظلمت کدہ میں صبح کی تنویر سا رہا
وہ زندگی کے خواب کی تعبیر سا رہا
لفظوں کی کائنات کا عنوان بن گیا
تحریر کے لبوں کی وہ مسکان بن گیا
اسلوبِ پرشکوہ کا وہ تاجدار تھا
لہجہ کے رنگ وروپ کی گویا بہار تھا
فکر ونظر کی وسعتیں اسکے قلم سے تھیں
دیدہ وری کی قربتیں اسکے قلم سے تھیں
اہلِ ہند کی آنکھ کا تارا تھا عمر بھر
تحریر کے چمن کو نکھارا تھا عمر بھر
اپنی شرافتوں کے نشاں چھوڑ کر گیا
بالاتفاق نکہتِ جاں چھوڑ کر گیا

قلب ونظر پہ چھایا ہوا خوش صفات ہے
محسوس ہو رہا ہے کہ اب بھی حیات ہے

کفیل الرحمٰن نشاط

معہد الانور
علامہ انور شاہ روڈ
دیوبند
تحقیقی
تربیتی مرکز
DSIGN BY DANISH AAMRI MOB.01336-330354